آنگن جب پردیس ہوا
افسانے
عذرا نقوی

آنگن جب پردیس ہوا

(دوسرا ایڈیشن چند نئے افسانوں کے ساتھ)

عذرا نقوی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

A'NGAN JAB PARDES HUA

(IInd Edition With Some New Short Stories)

by
Azra Naqvi
Unitech Horizon, Tower 11, Unit 502
Plot No. 6, Sector- pi-2
Greater Noida, G.B. Nagar-201308 (U.P)

Year of Edition 2013
ISBN 978-93-5073-192-5
₹ 200/-

نام کتاب : آنگن جب پردیس ہوا (افسانوں کا مجموعہ)
مصنفہ : عذرا نقوی (9958933161)
سنِ اشاعت : ۲۰۱۳ء
قیمت : ۲۰۰ روپے
مطبع : عفیف پرنٹرس، دہلی۔٦

Published by
EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
3108, Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6 (INDIA)
Ph: 23214465, 23216162, Fax: 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
Website: www.ephbooks.com

انتساب

اپنے ابا جان قیصر نقوی صاحب

کے نام

جنھوں نے مجھے جینے کا فن سکھایا

امّی سیّدہ فرحت صاحبہ

کے نام

جنھوں نے حرف و معنی سے متعارف کرایا

فہرست

پیش لفظ

مجھے یقین نہیں آتا کہ میری کہانیوں کا مجموعہ آخرکار چھپ کر قارئین تک پہنچ گیا۔ ان میں سے اکثر کہانیاں پچھلے بیس برس میں ہندو پاک کے ادبی رسائل میں شائع ہو چکی ہیں لیکن ان سب کو یکجا کر کے کتاب کی شکل دینے میں برسوں لگ گئے۔ اس میں میری کاہلی اور بے پرواہی کو بھی دخل تھا اور پھر میں سوچتی تھی کہ عذرا نقوی! اپنی شاعری یا کہانیوں کا مجموعہ چھپوا کر آپ کون سا تیر مار لیں گی۔ میرے خاندان میں ادیبوں اور شاعروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ ہر دوسرا شخص یا تو صاحب دیوان ہے یا کئی کتابوں کا مصنف ہے اس لئے کتاب چھپوانے میں مجھے کوئی انوکھی بات نظر نہیں آتی تھی۔ اس کے علاوہ میں نے ادب اور شاعری کے اتنے اونچے ناموں کو اپنا آئیڈیل بنایا ہوا ہے کہ خود کو ادیبہ یا شاعرہ کہلانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ یہ کتاب ''آنگن جب پردیس ہوا'' جو آج آپ کے ہاتھوں میں ہے اسکا سب سے بڑا کریڈٹ میرے شوہر ڈاکٹر پرویز احمد کو جاتا ہے جو برسوں سے میرے پیچھے پڑے ہوئے تھے کہ تم گھر اور باہر، دنیا بھر کے بے کار کاموں میں اپنا وقت برباد کرتی ہو اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو پسِ پشت ڈال دیتی ہو۔ لیکن اس مجموعے کے تاخیر سے چھپنے میں میرا ایک فائدہ ہوا، وہ یہ کہ میں نے پچھلے دو برس میں کمپیوٹر پر اُردو کی wordprocessing سیکھ لی اور اس نئے شوق کے چکر میں اپنی ساری کہانیاں خود ٹائپ کر ڈالیں جس سے ان کی نوک پلک اور بھی درست ہو گئی۔

میں شاعری اور نثر دونوں میں طبع آزمائی کرتی ہوں۔ میری ذات، زندگی اور دنیا کے مابین جو لین دین ہے، جو interaction ہے یہی میرے لیے تخلیق کا سرچشمہ ہے۔ یہ اظہارِ ذات بھی ہے اور میری روح کی غذا بھی ہے۔ جو بھی خامہ فرسائی میں کرتی ہوں وہ میری شخصیت کو

کچھ اور مکمل کر دیتی ہے اور شمع ہستی کو کچھ اور اجال دیتی ہے۔ کہانیاں میرے چاروں طرف بکھری ہوئی ہیں اگر لکھنے بیٹھوں تو اس کے لئے یہ عمر بھی کم ہے مگر لکھنے کے لئے کبھی ہمت نہیں ہوتی کبھی فرصت نہیں ہوتی یا شاید وہ دیدہ ریزی مجھ سے نہیں ہوتی جو کہانیاں لکھنے کے لئے ضروری ہے۔

زندگی نے مجھے اتنا کچھ دیا ہے کہ سنبھالے نہیں سنبھلتا۔ خاندانی اور سماجی ورثے میں مجھے جو اعلیٰ اخلاقی، سماجی اور ادبی اقدار ملی ہیں ان پر مجھے ناز ہے۔ میرے والد، قیصر نقوی مرحوم ایک روشن ضمیر، باعمل انسان تھے۔ وہ ایک سوشل ورکر تھے اور اپنی سماجی سرگرمیوں میں اپنے پورے خاندان کو شامل رکھتے تھے۔ اپنے والد سے میں نے سیکھا کہ کس طرح اپنے آئیڈیلز اور اصولوں کو ساتھ لے کر زندگی سے مفاہمت کی جاتی ہے۔ انھوں نے اپنے قول و فعل سے مجھے جینے کا فن سکھایا۔ ان سے میں نے اعلیٰ اخلاقی اقدار اور انسان دوستی کی قیمتی جاگیر ورثے میں پائی۔ میری والدہ سیدہ فرحت ایک بہت اچھی شاعرہ ہیں، لکھنے پڑھنے کا میرا شوق میری امّی کی ہی دین ہے۔ بچپن سے میں نے ان کے ہاتھ میں باورچی خانے کی کفگیر کے ساتھ ساتھ کتاب بھی دیکھی اور روٹی پکاتے ہوئے اشعار گنگناتے سُنا۔ میری ادبی زندگی کا آغاز اس دن سے ہوا جب میری امّی نے اپنی تصنیف کردہ لوریاں اور گیت سنا کر مجھے تھپکیاں دے کر سلایا جب اور بڑی ہوئی تو میرے دادا غلام احمد صاحب نے اپنے دلنشیں ڈرامائی انداز میں پرانے قصے کہانیاں، پہیلیاں اور کہہ مکرنیاں سنائیں۔ اپنے دادا سے ہی میں نے اردو پڑھنا لکھنا سیکھی۔ ابا جان نے بچوں کی کتابوں کی ایک چھوٹی سی لائبریری میری گڑیوں کے گھروندے کے ساتھ بنائی تھی، انھوں نے خود اپنے ہاتھ سے ان ننھی منی کتابوں کی جلد باندھی تھی اور ہر کتاب پر باقاعدہ نمبر ڈالے تھے۔ اپنے ننہیال میں ڈاکٹر عابد حسین، صالحہ عابد حسین کی مثال میرے سامنے تھی جن کی زندگی ہی علم و ادب سے عبارت تھی۔

زندگی میں مشاہدات اور تجربات کی ایک وسیع دنیا مجھے میسر آئی۔ میں خود کو خوش قسمت سمجھتی ہوں کہ مجھے تاریخ ساز علمی ادارے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں تعلیم حاصل کرنے کا موقع ملا۔ اس ادارے کا جو مخصوص کردار ہے اس نے میری ذہنی نشو و نما میں بہت اہم رول ادا کیا ہے۔ یہاں مجھے روشن خیالی اور تنگ نظری، روایت پرستی اور جدت پسندی کا ایک ایسا امتزاج ملا جس نے مجھے معروضی انداز سے چیزوں کو دیکھنا اور پرکھنا سکھا دیا۔ علی گڑھ سے ایم ایس سی کرنے کے

بعد دو سال دہلی کی جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں گزارنے کا موقع ملا، وہاں کی آزادیٔ فکر اور تعلیمی فضا نے ذہن کی کچھ اور پرتیں کھول دیں۔ اسی دوران آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس میں جز وقتی طور پر اناؤنسر کا کام بھی کیا۔ علی گڑھ کے بعد دہلی جا کر اندازہ ہوا کہ عذرا بی بی! دنیا میں ایک سے ایک قابل لوگ موجود ہیں اور یہ رواں دواں دنیا کسی کا انتظار نہیں کرتی۔

پرویز کے ساتھ مجھے دنیا گھومنے کا موقع ملا، امریکہ، کناڈا، عراق اور سعودی عرب میں مختلف یونیورسٹیوں میں وہ پروفیسر رہے اور میں بھی ان کے ساتھ ساتھ اپنے لئے تجربات اور مشاہدات کی دولت کماتی رہی۔ اس دوران میں نے تعلیم بھی حاصل کی، ملازمت بھی کی، سماجی کاموں میں بھی سرگرم رہی۔ کناڈا میں کئی سال کنڈرگارٹن میں بچوں کو پڑھایا اور چند سال برصغیر سے نئے آنے والے مہاجروں کے ایک کمیونٹی سینٹر میں کام کیا۔ اسی زمانے میں وہاں ایک تھیٹر گروپ ''تیسری دنیا'' کے نام سے قائم کیا جس میں برصغیر کے نوجوانوں کے علاوہ دنیا کے دیگر ممالک میں بسنے والے ہندوستانی نژاد لوگ بھی شامل تھے۔ اس گروپ میں ہم لوگ مل جل کر خود ڈرامے لکھتے اور پروڈیوس کرتے تھے۔ سعودی عرب میں مجھے ذہنی طور پر معذور بچوں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا تو زندگی کی ایک تلخ حقیقت کو قریب سے دیکھا۔ سعودی عرب میں تارکین وطن کی ایک اور ہی دنیا آباد ہے جو کناڈا اور امریکہ کے مہاجروں سے کافی مختلف ہے۔ زندگی کے اس میلے میں نئے نئے لوگ، مختلف رویے، زبانیں اور کلچر kaleidoscope کی طرح نئے نئے مناظر دکھاتے رہے۔ یہ دنیا میرے لئے ایک رنگا رنگ، بدلتے مناظر دکھانے والی جادوئی مشین بن گئی۔ میرے چاروں طرف بکھرے ہوئے یہ دلفریب لوگ جو اپنی محبتوں، خوبیوں، کمزوریوں، خوابوں اور اندیشوں کے ساتھ جی رہے ہیں یہ سب میرے اپنے ہیں۔ ہجرتوں کے سفر میں ذہن کے دریچے کچھ اور کھل گئے، انسانیت اور محبت پر میرا یقین اور پختہ ہوتا گیا۔

میں نے اپنی سماجی اور خاندانی میراث میں کچھ سماجی ذمہ داریاں پائی تھیں۔ میں نے آزاد ہندوستان میں آنکھ کھولی تھی، یہ وہ دور تھا جب طالب علم آئیڈیلز اور نظریات کی باتیں کیا کرتے تھے اور نئے خوش آئند زمانوں کے خواب آنکھوں میں سجائے اپنی دنیا آپ پیدا کرنے کی راہیں ڈھونڈ رہے تھے۔ ہمارے رول ماڈل وہ سیاست داں، دانشور، شاعر اور ادیب تھے جو انسانیت کی اعلیٰ قدروں کے امین تھے۔ آج جب ذرائع ابلاغ کی تندروی کے باعث دنیا ایک

عالمی گاؤں بن گئی ہے اور دنیا بھر کے انسان بہت قریب آ گئے ہیں لیکن دوسری طرف صارفیت کے تیز دھارے کی رو میں انسانی قدریں بہی جا رہی ہیں تو کبھی کبھی احساس ہوتا ہے کہ:

نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

خدا کی عطا کی ہوئی یہ حسین دنیا جس کو ہم بیدردی سے استعمال کر رہے ہیں مجھ سے بار بار یہ سوال کرتی ہے کہ تم نے میرے تئیں اپنی کیا ذمہ داری نبھائی؟ غربت، استحصال، ماحولیاتی آلودگی، تشدّد، جہالت، نفرتوں اور تنگ نظری کے بڑھتے سایوں کے خلاف تم نے کیا کیا؟ میں ایک بے بضاعت ہستی صرف الفاظ کے ٹوٹے چپوؤں کے سہارے پانی کے الٹے رُخ ناؤ چلا سکتی ہوں۔ ڈگریوں کے لحاظ سے میں سائنس کی طالبہ رہی ہوں لیکن کناڈا جا کر میں نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے لیے ایک اور راہ نکال لی اور ایجوکیشن کے میدان میں قدم رکھا۔ چھوٹے بچوں کی تعلیم کو میں نے صرف اس لئے اپنایا کہ نئی دنیا کے معماروں کو کم سے کم ایک صحت مند معاشرے اور ایک خوش آئند اور پُر امن زندگی کے خواب سجانا تو سکھا دوں، جیسے خواب میں نے اپنے دور اور اپنے بزرگوں سے میراث میں پائے تھے۔

سارے مسائل سب اندیشے ان کے حوالے کیسے کریں
چھوٹے بچوں کی آنکھوں میں کچھ تو خواب سجانے ہیں

میرے اس مجموعے میں ''ہجرت'' کا موضوع بہت حد تک چھایا ہوا ہے کیونکہ اوّل تو خود بنجاروں کی طرح شہر بہ شہر گھوم رہی ہوں، اور اس کے علاوہ یہ موضوع مجھے یوں بھی بہت fascinate کرتا ہے۔ ہجرت نے انسانی ارتقاء کے ہر دور میں نئے منظر نامے لکھے ہیں۔ ہجرت کے ساتھ منسلک جغرافیائی، معاشی اور سماجی تبدیلیاں انسان کی شخصیت کے نئے پرت کھولتی ہیں، نئے امکانات اور تضادات سامنے لاتی ہیں۔

میری زیادہ تر کہانیوں کے کردار نسوانی ہیں یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کیونکہ عورت ہونے کے ناطے میں ان کرداروں کو بہ آسانی سمجھ سکتی ہوں، ہر نسوانی کردار میرا اپنا بن جاتا ہے۔ ہر کہانی کچھ عرصے تک مجھ پر طاری رہتی ہے، تھوڑے دن تک میں خود وہ کردار بن کر جیتی ہوں۔ کوشش کرتی ہوں کہ میری ہر کہانی اپنے کرداروں سے لپٹے ہوئے سماجی، نفسیاتی، معاشی اور سیاسی عوامل کی پوری طرح سے عکاس ہو۔ کبھی کبھی عورت ہونے کے ناطے کچھ مصلحتیں، روایات اور

جھجک میرے آڑے آ جاتی ہے اور کہانی کے کردار و واقعات ادھورے سے محسوس ہوتے ہیں۔شاید وقت اور عمر کے ساتھ ساتھ یہ پل بھی کبھی پار کرلوں۔

دنیا کے kaleidoscope کو میری نظروں سے ان کہانیوں میں دیکھئے، اگر میرے کردار آپ کے اپنے بن گئے تو سمجھوں گی کہ میں کامیاب ہوگئی۔

عذرا نقوی

ریاض ۲۰۰۱ء

☆☆

زرد شاخ پر تتلی

پروفیسر اقبال اعجاز بیگ
ریاض، سعودی عربیہ

(یہ مضمون ریاض میں اس مجموعے کے اجرا کے موقع پر پڑھا گیا)

عذرا نقوی افسانہ نگار ہی نہیں شعر بھی کہتی ہیں۔ انھیں تخلیقی اظہار کا یہ سفر طے کرتے ہوئے دوہرے کرب سے گزرنا پڑتا ہے۔ افسانہ نگاری کو عذرا نقوی ذات کے اظہار کا حوالہ جانتی ہیں۔ وہ ذات جو اکائی میں اردگرد پھیلے ہوئے زمانے اور اس زمانے میں بودوباش رکھنے والے کرداروں سے رشتہ جوڑے ہوئے ہے۔ عذرا نقوی نے بحیثیت افسانہ نگار زندگی اور زندگی کے تماشے میں شامل مختلف اور متنوع کرداروں کا مشاہدہ کسی بالکنی سے نہیں بلکہ ان کرداروں کے ہم قدم رہ کر کیا ہے۔ وہ اپنے بیشتر افسانوں میں ان کرداروں کے محسوسات کے ساتھ سفر کرتی دکھائی دیتی ہیں۔

''آنگن جب پردیس ہوا'' کی مصنفہ کے خیال میں یہ دنیا اپنے تمام انکشافات سمیت رنگارنگ مناظر دکھانے والی ایک جادوئی مشین کی طرح ہے۔ مناظر کے ساتھ جب وہ رنگارنگ کا لفظ تحریر کرتی ہیں تو اس سے مراد واقعات کا مختلف حالات کے تحت مختلف زمانی اور مکانی العباد میں نمودار ہونا ہے۔ اس لئے تمام کردار ان کے افسانوں میں فکری، نفسیاتی اور سیاسی پیچیدگیوں کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ عذرا نقوی نے ایک بھرپور علمی اور تہذیبی فضا میں آنکھ کھولی۔ ان کا فکر اور شعور جس ماحول میں پروان چڑھا وہاں ان کے بزرگوں کے کچھ آدرش تھے کچھ نقوش تھے۔

لیکن بدلتی ہوئی اقدار کی تیز رفتاری نے ان نقوش کو رنگوں سے یکسر محروم کر دیا ہے۔ عذرا نقوی نے ان ادھورے آدرشوں اور خوابوں کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ بحیثیت افسانہ نگار وہ چاہتی ہیں کہ یہ ورثہ آنے والی نسلوں کے حوالے بھی کریں اور اس نسل کی نمائندگی کرنے والوں کی آنکھیں ان خوابوں سے آباد بھی رہیں جن کا سفر تعبیر کے اجلے منطقوں میں تمام ہوتا ہے۔

عذرا نقوی کے افسانوں کا بنیادی موضوع ہجرت ہے۔ قرۃ العین حیدر نے تہذیب اور کلچر کی گرتی دیوار کا نوحہ لکھا۔ پریم چند دیہات کے ماحول میں پلنے والے استحصال کو قلم بند کرتے رہے۔ انتظار حسین ان خوابوں سے گفتگو کرتے رہے جو ہجرت کے لمحے میں ان کے ساز و سامان کے ساتھ بندھے چلے آئے۔ افسانہ نگار عذرا نقوی ملکوں ملکوں گھومی ہیں اور دور دراز خطوں کی سیاحت کی ہے۔ ہجرت کے تجربے اور اس کی تحیر انگیزی سے گزری ہیں۔ ہجرت کرنے والے کرداروں کے درمیان زندگی کی ہے۔ ان کرداروں کے حوالے سے تہذیبی، فکری، معاشی اور ثقافتی ڈھانچے کی شکست و ریخت اور تازہ صورت پذیری کا مطالعہ کیا ہے۔ لہٰذا ان کے افسانوں کا موضوع ہجرت ہی قرار پاتا ہے۔

عذرا نقوی نے اپنے افسانوں میں آس پاس پھیلی زندگی کے تعلق اور رشتے سے مرتب ہونے والے منظر نامے پیش کئے ہیں۔ انھیں اپنے افسانوں کے ہر کردار سے، اس کی خوبصورتی اور بدنمائی سمیت حد درجہ انس ہے۔ یہ کردار تمام تر کسمپرسی کے باوجود زندگی کے کٹے پھٹے ورق پر جینے کی امنگ تحریر کرتے ہیں۔ اپنے کپکپاتے ہوئے ہاتھوں سے خوش آئند زمانوں کی دستاویز قلم بند کرتے ہیں۔

مغربی افسانے کے قارئین موپاساں کی تکنیک کے ڈرامائی انداز کے کچھ یوں گرویدہ ہوئے کہ پھر وہ ہر افسانے کے اختتام پر اسی اچانک چونکا دینے والی کیفیت کو تلاش کرنے لگتے ہیں۔ بلاشبہ افسانے کی مذکورہ تکنیک اور تحریک نے اس فن کو ایک طویل عرصے تک اپنی گرفت میں رکھا۔ عذرا نقوی کے کچھ افسانے قارئین کو اس تحریک سے الگ ریوتاثر کی کیفیت کے قریب قریب نظر آئیں گے۔ اس کے باوصف وہ فنی بنیاد، گہرائی، اور تاثر کے لحاظ سے کامیاب افسانے ہیں۔ 'رانی' 'واپسی کا سفر' 'الہ دین کا چراغ' اور 460 ایلمر اسٹریٹ اسی قبیل کے افسانے ہیں۔

افسانہ 'بوگن ویلیا کی اوٹ سے' بیانیہ تکنیک میں لکھا ہوا، اس مجموعے میں شامل

بہترین افسانوں کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس افسانے میں آگاہ کیا گیا ہے کہ ہمارے وجود اور ارد گرد پھیلی ہوئی بدنمائی کے بیچ اگائی ہوئی بوگن ویلیا کی بیل کو جلد یا بدیر ڈھیر ہو جانا ہے۔ سبز پتوں پر موت کا لمحہ وارد ہونے کو ہے۔ اور زندہ رہنے کے لئے ہمیں آخر کار زرد اور گرم ہوا کے جھکڑوں میں سانس لینے کے ہنر اور عمل سے گذرنا ہوگا۔ اس بدنمائی اور کراہت سے خبردار رہنا ہوگا جس نے ہمارے گھروں اور ہمارے گھروں کے آنگنوں کی طرف ایک سفر کا آغاز کر دیا ہے۔ یوں دیکھا جائے تو دراصل عذرا نقوی کے افسانے دنیا کے حسن کو تاراج کرنے والے بدنما ہاتھوں کے نام ارسال کئے جانے والے ایک احتجاجی مراسلے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

افسانہ 'رین چیک' اپنے موضوع اور اسلوب کے اعتبار سے اس مجموعے کے انتہائی اثر انگیز افسانوں میں شمار کیا جانا چاہیے۔ یہ ان لوگوں کی روداد ہے جو مغرب کی سرزمینوں پر قدم جماتے ہیں اور اپنی تہذیبی اقدار کو اپنی آنکھوں کے سامنے جڑوں سے اکھڑتے دیکھتے ہیں۔ تہذیب کی بنیاد پہ نئی نسل کی بے راہروی کے حوالے سے لکھے جانے والے اس افسانے میں، موضوع کی مناسبت سے قلم کو کھل کھیلنے کی کافی گنجائش حاصل تھی لیکن مصنفہ کا محتاط اور حساس قلم اس پل صراط سے اسی قابلِ ذکر فنی دسترس کے ساتھ گذرا ہے....ہم کھلی آنکھوں سے اس واقعے کی جزئیات سے گذر جاتے ہیں جو کہ ہمارے سامنے رونما نہیں ہوا تھا۔ یہ افسانہ انتہائی محفوظ قدروں کی تاراجی کا وہ نوحہ ہے جو لب تک نہیں پہنچ پاتا لیکن اس کی آواز ہمارے دلوں کے اندھے کنوؤں میں پیہم چکراتی پھرتی ہے۔ عذرا نقوی کا افسانہ 'رین چیک' اسی فسردہ و شکستہ آواز کی ایک پتھرائی ہوئی شبیہ ہے۔

عذرا نقوی کے افسانوں کے بیشتر کردار اپنی زمینوں اور اپنے آدرشوں سے جدائی کا دکھ سہنے والے کردار ہیں لیکن مصنفہ کے قلم کا اعجاز یہ ہے کہ حالات کی اس المناکی کے باوجود یہ کردار زندگی سے جڑے ہوئے اور زندگی سے محبت کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

'دو گز زمین' 'ڈیڈ انڈ' 'واپسی کا سفر' 'رین چیک' اور 'بے خانماں' ایسے افسانے ہیں جو اپنی زمینوں سے کسی روشن دیار کی طرف سفر کرتے ہوئے قدموں کے غبار سے اٹے ہوئے ہیں لیکن افسانہ نگار عذرا نقوی اس گرد آلود منظر سے ایک چمکدار راستہ نکالنے کا ہنر بھی اپنے قاری کو ودیعت کرتی جاتی ہیں اور یہ عمل ان کے فنی اور تخلیقی اظہار کا سب سے زیادہ قابل ذکر پہلو ٹھہرتا ہے۔

عذرا نقوی اپنے افسانوں مین اس زمین پر جگہ بناتی ہوئی بد ہیئتی کو ایک خوشروئی میں تبدیل ہوتے دیکھنے کی شدت سے خواہاں ہیں۔ اپنے افسانوں کے ذریعے وہ ان گم شدہ صحیفوں کی تلاش میں سرگرداں ہیں جو کبھی ان زمینوں پر شعاعوں کا سندیسہ لے کر نازل ہوئے تھے۔ وہ دیواروں سے دلوں تک رونما ہونے دھبوں کو امید بھری چمک میں بدلتے ہوئے دیکھنا چاہتی ہیں۔ عذرا نقوی کے تحریر کئے ہوئے افسانے اصرار کرتے ہیں کہ شہر کے مکانوں کی کھلی کھڑکیوں کی طرف سفر کرنے والی مسموم ہواؤں کے رُخ کو بہر حال تبدیل ہونا چاہیے۔ اپنی تمام ترالمناکیوں کے باوجود افسانہ نگار عذرا نقوی کو یقین ہے کہ زندگی اپنے کرداروں کے لئے، آنے والے وقت میں اک جاں فزا مژدہ لے کر ضرور پہنچے گی کیوں کہ محبت اور انسانیت پر ان کا یقین ابھی ڈگمگایا نہیں ہے۔ اس لحاظ سے اپنے افسانوں میں عذرا نقوی کی شخصیت اس خوشرنگ تتلی کی طرح نظر آتی ہے جو پھول کھلنے کے ایک یقینی موسم کے انتظار میں کسی زرد شاخ پر بسیرا کئے ہوئے ہے۔

Azra's endless search for human models

Book review

By Muhammad Tariq Ghazi

(Published in Saudi Gazette, Jeddah)

In her endless search for role models in modern society, Azra Naqvi collected a few tragedies of truth, which she found scattered all around in societies of the East and the West. She looks for goodness and virtue, and discovers that today's society is cruel and inhuman. But she does not deliver sermons; only takes an alarming situation to a poignant point of caution. And there her stories suddenly end, leaving the reader alone to contemplate that situation.

Some critics believe that, while Urdu novel - with such examples as 'Khuda Ki Basti', 'Aag Ka Darya' and 'Udaas Naslein' - can be compared with the best in the world, Urdu short story has yet to reach that high plain of Western art of storytelling. The assertion may be misplaced. In many cases, while it deals with the local milieu, today's Urdu short story seems to have been influenced by its American counterpart:

modern Urdu short story is also characterized by an element of surprise in the closing paragraph. This technique is usually applied to shock the reader, leaving him or her often aghast, and to enable him or her to remember the tale for a long time after having finished the reading. Azra has used this technique in almost every story in her first collection, 'Aangan Jub Pardes Huwa'. Nevertheless, her stories remain firmly grounded in Urdu's homeland, even though some of her characters are Western and Far Eastern. Nine out of the 14 Aangan stories are about social conflict and culture shock that the South Asian immigrants are facing in a different world, that's Canada.

This contrast gives a special meaning to the title of Azra's book, Aangan Jub Pardes Huwa. It is almost impossible to translate the cultural significance of this phrase into English, in a similarly brief phrase. Nostalgia, in one word, partly represents the human experience that Azra wishes to highlight through this title, which is also the title of one of the Aangan short stories, in which aangan, personified by mother, finally emerges victorious. That is why nostalgia, which is nothing but a state of mind, in itself is too deficient a word to make a cultural statement intended by the phrase Aangan Jub Pardes Huwa. I will try to explain it, for without some understanding of this cultural statement, even an Urduphile cannot really enjoy Azra's collection of short stories.

Aangan is "homeyard" - an open, roofless space within the family quarters in the old South Asian house. It is generally surrounded by verandahs in front of a single room or a cluster of inter-connected rooms. Until recent times that architectural style was the landmark of the now-dying South Asian culture that

prevailed before the modernized cities - and towns - opted for Western-style multi-storied apartment buildings.

This open space at the heart of the old houses would have the sky monitoring day and night every member of a large joint family. The aangan served as living area in winter season when people would prefer to sit under the sunlight to warm themselves up during cold daytime; and during the summer months as the sleeping area under the black, star-studded night sky. The inhabitants would have fruit trees planted in corners of the aangan, also intended to provide shade in hot summer afternoons; and line it with flower shrubs to maintain a round-the year supply of flowers and buds to adorn the house-woman's braided hair, and ear lobes of little girls. In summer nights, children and adolescent would play games like 'aankh micholi' (hide-and-seek) in the semi-dark nooks and corners of the aangan. During the monsoon season, young girls would use the strong branches of the aangan tree for hanging swing-ropes. Crooning in unison folk songs about seasons, about the loved ones and friends, and about an amiable town society, they would alternate on the swing and standing to give push to the other swinging companions. For the married women, the aangan symbolized parental love and care and the company of brothers, sisters, cousins, and friends. In her husband's home, she would fondly sing the praise of her parents, her brothers, her sisters, her cousins, and her childhood companions. No wonder that South Asian folk songs would be incomplete if they did not have an affectionate mention or longing for the aangan in the ancestral home.

Thus, aangan was the most important part of the house.

In fact, it was more than just another part of the house - it was cultural nerve center in sprawling homes in small town societies - though it is disappearing and does not carry the same cultural significance in the changed living style.

The opposite of aangan is pardes. "Des" is country, homeland, and pardes is the "other country", the "alien land", usually referring to the village or town of the husband, where a married woman living in a different, "alien", joint family with her edgy in-laws, still fondly recalls the carefree life she enjoyed in her parental home in the compassionate company of her sisters, brothers and other companions; as compared to the onerous household responsibilities that she now bears at her husband's house.

The title of Azra's collection of short stories, thus projects the contrast in two life-styles not only in their old cultural sense but also in terms of Oriental and Occidental behavior patterns and value systems to which the first generation immigrants to Canada - or any other Western country - are exposed. In simple terms, the title of the book highlights the current social conflict, which has transformed the aangan into pardes - association into alienation, concord into clash. This is the fate of South Asian societies, as this title reflects the changing ethos of South Asians in their adopted Western homelands.

Azra spent her early life in the north Indian university town of Aligarh; then she moved to New Delhi as a university lecturer and radio announcer; before traveling widely with her scientist-poet husband, Pervez Ahmad. She lived in Canada, the United States, Iraq and Saudi Arabia. Wherever she stayed,

she did not just while away her time - she tried to live a meaningful life, leaving an impact of her dynamic personality on the people who came in contact with her, and also imbibing liberally from the host cultures.

She has a keen observation and proclivity to portray mystifying human situations, which generally fail to stir the conscience of most of

us who are the involuntary victims of our fast-paced modern life.

Azra expertly weaves her observations and experiences into tales of profound emotions. The Aangan stories are either about north Indian towns like Aligarh, or about mutually indistinguishable towns and cities of Canada. As a storyteller, Azra becomes an invisible part of the texture of her tales, always reminding the reader that the author is somewhere around.

When she is not writing about Canada, she is writing about Aligarh - Aligarians after all take the charge of being Aligarh-chauvinist as a compliment. Her stories about that "dirty city of beautiful people" portray the cultural degeneration being witnessed by those living in the campus area. Through Professor Saqib, one of her characters, Azra expresses outrage at the hordes of "retired Muslims from everywhere" invading Aligarh, and destroying its unique culture and quietude of the town.

Aangan is essentially a woman's view of a small world. While reading some of these stories, I wondered how would literary giants such as Krishan Chandar, Rajindar Singh Bedi or Ghulam Abbas have treated subjects that Azra has chosen for

narration. Of course, these giants belonged to a different era which did not experience the pangs and pleasures of the life of rootless immigrants, yet Azra's treatment of these subjects confirms that just being woman is not enough for writing stories like "Rain Check": Ismat Chughtai and Wajeda Tabassum might have gone overboard if they had got to write the story of psychological unpredictability of a "Canadian" teenage daughter and her still-Asian mother. It requires certain cultural finesse to poetically deal with harsh realities - like the reference to the shocked mother secretly removing the doll, wearing the South Asian red bridal attire, from the daughter's wardrobe.

Azra is a poet, too - Chughtai and Tabassum weren't, nor were Krishan, Bedi and Abbas. And Azra insists that she is a poet first. A poet's sensitiveness gives her a unique advantage to interlace crude bits and pieces in a delicate texture, without losing touch of reality and still be able to surprise the reader in the final few lines. A stalwart like Ahmad Nadeem Qasmi shares this advantage.

While in Canada, Azra also tried her hand at theater. Perhaps that experience, if not a compelling desire to maintain her short story brief, is reflected in Azra's ability to change scene pretty quickly, as one sees it in movies. However, in some instances, this confuses the reader, as in "Wapsi Ka Safar", an autobiographical narration, extending from Montreal to Aligarh. However, if properly applied, Azra can make this technique to add awe and astonishment.

Readers may wonder how Azra deals with such delicate subjects so deftly. Well, she hails from a family of intellectual giants, and her husband, Pervez Ahmad himself is an

accomplished computer scientist, a poet and a painter. Yes, none other than Azra's life partner has designed the highly imaginative cover of 'Aangan Jub Pardes Huwa'.

ENDS

Jeddah, Saudi Arabia
Thursday 27 December 2001

دو گز زمین

نیم غنودگی کی حالت میں ان کے کانوں میں اماں کے مناقب پڑھنے کی آواز آ رہی تھی۔

سامان شتاب کردے مرے دل کے چین کا
پرور دگار واسطہ پیا رے حسین کا

فجر کی نماز کے بعد آنگن کے کونے میں بنے لال پتھر کے چبوترے پر بیٹھی اماں روز پر سوز آواز میں مناقب پڑھتی ہیں... تنویر زہرا گھبرا کر اٹھ بیٹھیں ارے! فجر کی نماز قضا ہو جائے گی اماں... کہاں ہیں... یہ کون سی جگہ ہے... سامنے کی کھڑکی سے برابر والے مکان کی چھت پر جمی ہوئی برف کی تہہ نظر آئی۔ نیچے لِونگ روم سے صبح کی خبروں کی آواز آ رہی تھی۔ کچن میں بہو اور بچوں کے چلنے پھرنے کی آوازیں تھیں۔ وہ حسب عادت خود سے بولیں۔

''لے تنویر زہرا ہو گئی ایک اور صبح'' سرہانے رکھی Digital گھڑی پر نظر ڈالی صبح کے ساڑھے چھ بجے تھے۔ انھوں نے سوچا ''یہ گھڑی اور رات بھر بھوت بن کر ہولاتی رہتی ہے... ایک تو نیند ویسے ہی غائب اور پھر یہ گھڑی ہر ہر منٹ ہندسہ بدل کر باؤلا بناتی ہے۔ رات بھر اس پر سے نظر ہی نہیں ہٹتی، ڈائن کی طرح آنکھیں چکا چکا کر تکتی رہتی ہے، سو گئیں تنویر زہرا؟... کل رات بھی شاید تین بجے کے بعد نیند آئی ہو گی، وہ بھی نیند کی دوسری گولی کھانے کے بعد، کتنی بار مرتضٰی سے کہا یہ گھڑی ہٹا لے یہاں سے... مگر اس کے خیال سے تو یہ گھڑی اچھی ہے کہ اماں کو اندھیرے میں بھی وقت کا پتہ چل جائے... ارے مجھے وقت کا پتہ چلنے نہ چلنے سے کیا فرق پڑتا ہے''۔

تنویر زہرا بمشکل گھٹنے پر ہاتھ رکھ کر اٹھیں۔ باتھ روم جانا بھی ان کے لئے ایک مشکل کام تھا۔ کھڑے ہو کر واش بیسن میں وضو کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ وضو کر کے نماز پڑھنے کے

بعد وہ نیچے آئیں تو مرتضٰی باہر سے گھر کے سامنے کے راستے سے برف ہٹا کر آرہا تھا۔ٹوپی اور دستانے برف سے اٹے ہوئے تھے، کان اور ناک سرخ ہو گئے تھے۔ اس نے جب دستانے اتارے تو انھوں نے دیکھا کہ انگلیاں بھی لال ہو گئی تھیں۔ان کا دل بیٹے کے تڑپ گیا، بولیں۔

''ارے کیوں مصیبت میں پڑتا ہے روز صبح، پڑی رہنے دے برف، خود پگھل جائے گی''۔

مرتضٰی نے جھلاہٹ پر قابو پاتے ہوئے بڑے رسان سے اماں کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''ارے اماں! اگر روز برف نہ ہٹاؤں تو برف کا ایک پہاڑ کھڑا ہو جائے گا دروازے کے سامنے، اور پھر گیراج سے گاڑی نکالنے کے لئے بھی تو راستہ صاف کرنا تھا نا! کل رات بھر برف پڑی ہے''۔

تنویر زہرا نے کچن کی کھڑکی سے جھانک کر دیکھا' پچھواڑے کے مکان میں مسٹر سوائے اپنی گاڑی سے برف ہٹا رہے تھے، وہ بولیں۔

''ارے بالے! سردیوں میں گاڑی چلانے کی کیا ضرورت ہے۔بس سے چلا جایا کر، برف کے زمانے میں تُو گاڑی لے کر جاتا ہے تو دن بھر مرا جی ہولتا رہتا ہے''۔

مرتضٰی کو اماں پر غصہ بھی آیا اور پیار بھی، بولے۔

''اماں آپ کو کسی طرح چین نہیں، کراچی میں جب بس میں بیٹھ کر ناظم آباد سے کلفٹن جاتی تھیں تو دعا مانگا کرتی تھیں کہ مولا! ایک دن ایسا بھی کرنا کہ میرے مرتضٰی اور ارتضٰی کے پاس بھی گاڑی ہو، آپ کو کلفٹن والے خالو ابا کی گاڑی دیکھ کر کیسا رشک آتا تھا''۔

کچن میں ان کی بہو رضیہ جلدی جلدی بچوں کا لنچ پیک کر کے دے رہی تھی، مرتضٰی کو بھی کاغذ کے براؤن لفافے میں سینڈوچ، جوس اور ایک سیب رکھ کر لنچ کے لیے دے دیا، اور جلدی جلدی کوٹ، بوٹ، دستانے اور ٹوپی پہن کر اپنے لنچ کا براؤن لفافہ لے کر کام پر جانے کیلئے تیار ہو گئی، بچے بھی اسکول کی بس لینے کے لئے قریبی بس اسٹاپ پر چلے گئے۔

دھڑ...دھڑ.. دروازے بند ہونے کی آوازیں، گیراج کا شٹر بند ہونے کی آواز...

''سب چلے گئے'' تنویر زہرا خود سے بولیں۔اب گھر میں مکمل سناٹا تھا سوائے نیچے چلتے ہوئی ہیٹنگ کرنے والی Furnace کی آواز کے جو متواتر آرہی تھی۔ وہ آکر چڑیوں کے پنجرے کے پاس کھڑی ہو گئیں۔یہ چھوٹی چھوٹی رنگین چڑیاں پچھلے مہینے مرتضٰی کے بیٹے علی نے انہیں تحفے

میں دی تھیں کہ یہ آپ کا برتھ ڈے گفٹ ہے۔ وہ ہنس پڑی تھیں۔ ''اوئی اس بڑھاپے میں اب میری سالگرہ ہوگی، ساری عمر تو منائی نہیں''۔ یہ چڑیاں اب ان کی دن بھر کی ساتھی بن گئی تھیں۔ تنویر زہرا چڑیوں سے باتیں کرتی تھیں مگر ان کا خیال تھا کہ چڑیاں اردو سمجھ تو جاتی ہیں مگر بولتی انگریزی ہیں۔

تنویر زہرا نے کچن پر نظر ڈالی۔ چمکتا ہوا، صاف ستھرا، ہر چیز جگہ پر رکھی ہوئی تھی۔ وہ پھر چڑیوں سے مخاطب تھیں۔

''ایک تو میں رضیہ کے سگھڑاپے سے بھی پریشان ہوں، کام کر کر کے مری جائے ہے، کتنا کہا کہ رہنے دے میں روز کوئی سالن پکا دیا کرونگی مگر نہیں... سب خود ہی کرے گی۔ اتوار کے روز دن بھر کھڑے ہو کر ہفتے بھر کے لئے کھانے پکا پکا کر فریزر میں رکھ دے گی، اے ہے! یہ بھی کوئی بات ہوئی کہ روز روز کھانا پکانے سے گھر میں پیاز اور مسالوں کی بو بس جاتی ہے... دوپہر میں علی آئے گا اسکول سے، خود ہی فرج سے اپنی وہ اسپگیٹی یا Pizza نکالے گا، Microwave میں خود گرم کرے گا اور کھالے گا... کتنا کہا کہ لا بالے! تیرے لئے تازہ روٹی ڈال دوں، پراٹھا پکا دوں، مگر نہیں... اسے تو یہ ہی امریکن کھانے پسند ہیں''۔

چڑیوں نے چوں چوں کر کے گویا ان کی حامی بھری۔

تنویر زہرا Living Room کی کھڑکی میں آ کھڑی ہوگئیں، سامنے صاف ستھرے مکانوں کی قطار تھی۔ چمنیوں سے دھواں نکل رہا تھا، برف سے مکانوں کی چھتیں اور راستے ڈھکے ہوئے تھے۔ وہ برف صاف کرنے والی مشین کے انتظار میں کھڑی ہوگئیں، ابھی وہ دیو جیسی مشین آتی ہوگی اور سڑک کی ساری برف سرکا کر کنارے کر دے گی، اور سڑک کے دونوں طرف برف کی چھوٹی سی دیوار اور اونچی ہو جائے گی... اب صبح کے 9 بج چکے تھے آفس اور دوسری ملازمتوں پر جانے والے جا چکے تھے اس لئے سڑک پر کوئی اِکا دُکا گاڑی گذر جاتی تھی، دس بجے کے قریب سامنے والے مکان سے دو بچے، لال پیلے اسنوسوٹ پہنے ہوئے نکلیں گے اور برف پر لوٹیں لگائیں گے۔

''شاباش ہے ان کی ماں کو بھی، اس سردی میں بھی بچوں کو باہر نکال دیتی ہے'' تنویر زہرا سوچتی تھیں۔

10 بجے اک بڑی بی سر سے پاؤں تک گرم کپڑوں میں ملفوف، اپنے کتے کو ٹہلانے نکلیں گی۔

''غضب کی ہمت ہے بڑھیا کی کہ اُس سردی اور برف باری میں بھی گھومنے سے باز نہیں آتی'' وہ حیران ہوتی تھیں۔

گھڑی پر نظر ڈالی، ابھی تو صرف ساڑھے نو بجے تھے، ''اب کیا کروں، ناشتہ کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔ فرج میں جوس، پھل، ڈبل روٹی، انڈے سب بھرے پڑے ہیں مگر کھانے کو دل ہی نہیں چاہتا، اکیلے کیا خاک اچھا لگتا ہے کھانا پینا۔''

''اب مجھے یہاں کناڈا آئے تقریباً ڈیڑھ سال ہوگیا... انھوں نے سوچا... مگر لگتا ہے کہ جیسے برسوں ہوگئے ہیں۔ ارتضٰی کے پاس سعودی عرب میں بھی رہ کر آئی چند مہینے، وہاں بھی میں اور ارتضٰی کی بیوی دن بھر گھر میں بند، شام کو ارتضٰی آتے، اگر تھکے ہوئے نہیں ہوتے تو گاڑی میں بیٹھا کر گھما پھرا لاتے۔ خیر سے وہاں حج تو ہوگیا مگر وہاں بھی کیا جی لگتا میرا، مرتضٰی نے یہاں کناڈا بلانے کی ضد پکڑ لی۔ اماں اور بابا کیا کریں گے اکیلے کراچی میں، رضیہ باجی بھی شادی ہو کے دبئی چلی گئی ہیں۔ مرتضٰی کے ابا کسی صورت کناڈا آنے پر راضی نہیں تھے اور نہ ہی آئے۔ جب تک کناڈا کا Immigration کا ویزا آئے اللہ ہی نے ان کا ویزا بھیج دیا.......... ابا کے مرنے کے بعد دونوں بھائی آئے۔ باپ کا بنوایا ہوا گھر بیچ باچ کر، لے آئے مجھے اپنے ساتھ یہاں...

کیا نام ہے اس شہر کا؟... Windsor، جب یہاں آئی تھی تو مرتضٰی اک پندرہ منزلہ اونچی بلڈنگ کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا، اندرونِ شہر تھی وہ بلڈنگ، کھڑکی میں کھڑی ہو جاتی تھی اور سڑک کی چہل پہل دیکھ لیتی تھی... اب دس مہینے ہوئے ماشاء اللہ یہ مکان خرید لیا ہے۔ رضیہ کتنے فخر سے دکھاتی ہے اپنے ملنے والوں کو... فور بیڈ روم کا مکان ہے، بچوں کے کھیلنے کے لئے Basement بھی ہے، گیراج میں کہتے ہیں دو گاڑیاں کھڑی ہو سکتی ہیں...... مکان جب سے خریدا ہے مرتضٰی نے تو بس میاں بیوی مورگیج کی ہی باتیں کرتے ہیں اک دن میں نے پوچھا تھا کہ یہ مورگیج کیا بلا ہے، تو رضیہ نے کچھ سمجھایا تھا کہ اماں! اتنا پیسہ ہر مہینے بینک کو دینا ہوتا ہے ورنہ مکان بینک لے لے گا۔ میری سمجھ میں تو کچھ نہیں آیا... ایک وہ انڈیا میں کسٹوڈین کا قصہ تھا۔

پاکستان بننے کے بعد جب چچا ابا کراچی آ گئے تھے تو کسٹوڈین نے قبضہ کرلیا تھا ان کے مکان پر...... اب پتا نہیں یہ مورگیج کیا ہے... اور جب ہم پاکستان آئے تو ہر وقت قصہ رہتا تھا کلیم کا' الاٹمنٹ کا ... مگر ہمیں کیا ہاتھ آیا... خاک... مرتضیٰ کے ابا سرکاری ملازم تھے انڈیا میں، سو وہ پاکستان آ گئے تھے۔ وہاں بھی کیا تھا، اک پرانا آبائی مکان امروہے میں۔ اور کراچی میں وہ بھی نصیب نہ ہوا... سنا ہے لوگوں نے بڑے بڑے الاٹمنٹ کرائے۔''

انھوں نے غیر ارادی طور پر گھڑی کی طرف دیکھا تو دن کے دس بج چکے تھے، سوچا کہ چلو پودوں میں پانی ہی ڈال دوں۔ رضیہ نے گملوں میں طرح طرح کے پودے لگائے تھے۔ گھر کے اندر اچھی خاصی پھلواری بن گئی تھی۔ پودوں کی دیکھ بھال کا کام تنویر زہرا نے اپنے ذمے لے لیا تھا، کراچی کے چھوٹے سے مکان کے آنگن میں بھی تنویر زہرا نے کچھ حصہ کچا رہنے دیا تھا اور وہاں بیلے کے پھول لگائے تھے۔

''نہ جانے وہ بیلا زندہ ہوگا یا مر گیا ہوگا'' وہ آزردہ ہو گئیں۔

ان کے دماغ میں تو ابھی میرٹھ والے گھر کے آنگن کے امرود اور موگرے کی خوشبو بسی ہوئی تھی۔

وہ بہت لگن سے ہر گملے میں پانی ڈالتی رہیں۔ ربر پلانٹ کے پتے گیلے کپڑے سے صاف کیے۔ پودوں پر اسپرے کیا، وہ روز ہر گملے کو دیکھتیں کہ کتنے نئے پتے نکلے۔ کبھی کبھی انھیں پودوں پر ترس آتا کہ بے چارے کبھی باہر کی تازہ ہوا بھی نہیں پاتے۔ انھوں نے کھڑکی سے باہر نظر ڈالی۔ سامنے یارڈ میں میپل (Maple) کا درخت ٹنڈ منڈ کھڑا تھا۔ انھوں نے حساب لگایا... جنوری، فروری، مارچ، اپریل... تب کہیں اپریل کے آخر میں سوکھی شاخوں سے پتے سر نکالیں گے۔ جون جولائی میں درخت خوب ہرا بھرا ہو جائے گا، پھر اکتوبر میں جب پتے سرخ ہو جائیں گے تو پیڑ پر آگ سی لگتی معلوم ہوگی، جب بہت خوبصورت لگتے ہیں یہ میپل کے درخت، اور ابھی اکتوبر ختم بھی نہیں ہوگا کہ سوکھے پتوں سے پھر یارڈ بھر جائے گا... پھر وہی ٹنڈ منڈ درخت... پھر وہی گرمیوں کا انتظار... نہ جانے اگلی گرمی دیکھوں گی یا نہیں...'' انھوں نے سوچا۔

اب انھیں دن کے ایک بجے کا انتظار تھا جب مرتضیٰ کا بیٹا علی اسکول سے آئے گا تو ذرا رونق ہوگی۔ بڑی بیٹی سارہ تین بجے اسکول سے آئے گی، مرتضیٰ اور رضیہ شام کو چھ بجے

آئیں گے، سردیوں میں تو چھ بجے اندھیرا ہو جاتا ہے۔ مرتضٰی واپسی میں رضیہ کو کام پر سے لیتا ہوا آتا ہے۔ انہیں رضیہ پر ترس آتا تھا، وہ کام سے واپس آ کر کھانا گرم کرتی، کھلاتی، کچن صاف کرتی، برتن دھوتی اور مرتضٰی بیٹھ کر T.V. دیکھتے تھے.......... رضیہ خواہ مخواہ گھر سے باہر کام کرتی ہے، کیا فائدہ جان کھپانے سے۔ ایک بار انھوں نے مرتضٰی سے کہا تھا ''کیوں بیوی سے نوکری کراتا ہے''۔

اس نے جواب دیا تھا۔

''اماں! رضیہ ہی کو زیادہ شوق تھا مکان خریدنے کا، صرف میری تنخواہ سے تو مورگیج ادا ہو نہیں سکتا تھا' اس لئے رضیہ نے بھی کام شروع کر دیا' فیکٹری میں پرزے جوڑنے کا کام ہے رضیہ کا۔''

فون کی گھنٹی بجی، تنویر زہرا فون کی گھنٹی سے ہمیشہ گھبرا جاتی تھیں۔ انھوں نے سوچا ''ہو سکتا ہے مرتضٰی کا فون ہو... میری خیر خبر لے لیتا ہے دن میں وہ اک آدھ بار... کیا پتہ کسی اور کا فون ہو... کوئی انگریزی نہ بولتا ہو.. کوئی بات نہیں، کہہ دوں گی مسٹر مرتضٰی ناٹ ہوم، اور رکھ دوں گی فون''۔ گھنٹی بجے ہی جا رہی تھی۔ انھوں نے فون اٹھایا، فون پر رضیہ کی دوست ثمینہ چودھری تھی وہ بھی دن میں کبھی کبھار فون کر لیتی تھی، اِدھر اُدھر کی دو چار باتیں کر کے تنویر زہرا کا دل بہل جاتا تھا، حالانکہ ثمینہ پنجابی تھی مگر تنویر زہرا کو یہاں وہ ہی غنیمت معلوم ہوتی تھی۔

ثمینہ فون پر نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی ...لیکن تنویر زہرا کے دماغ میں بس اک جملہ اٹک کر رہ گیا.. آٹھ ہزار ڈالر...

رات کو کھانے کے بعد جب مرتضٰی اور رضیہ بیٹھے T.V. دیکھ رہے تھے تو تنویر زہرا کے اس سوال نے دونوں کو چونکا دیا۔

''بالے! مرتضٰی، کیا 8 ہزار ڈالر کی رقم بہت ہوتی ہے''۔

مرتضٰی حیران ہوا کہ اماں آج روپے پیسے کے چکر میں کیسے پڑ گئیں، وہ تو یہ بھی بڑی مشکل سے سمجھ پاتی تھیں کہ ایک ڈالر میں کتنے پاکستانی روپے آتے ہیں۔

مرتضٰی نے پوچھا ''کیوں اماں کیا ہوگا 8 ہزار ڈالر کا''۔ تنویر زہرا ٹال گئیں۔

''کچھ نہیں یوں ہی پوچھ رہی تھی''۔

وہ جلدی ہی اٹھ کر سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئیں۔ نیند کی گولی کھائی، رات کی دعائیں پڑھیں، دستک دی اور لیٹ رہیں...... وہی سوال دماغ میں گھومے جا رہا تھا۔ آٹھ ہزار ڈالر... اچھا اگر مرتضٰی کے پاس نہ ہوئے تو ارتضٰی کو خط لکھوں گی وہ دے دے گا۔ انھیں تھوڑا سکون ہوا... آنکھیں مندنے لگیں... لگتا ہے آج کمرے کی ہیٹنگ زیادہ تیز ہے... نیند جلدی آ گئی۔

یہ کیسا مجمع ہے... کس کا جنازہ ہے... چالیسواں ہے اماں کا؟... نہیں مرتضٰی کے ابا کا سوئم ہے... یہ کس کی قبر ہے بیری کے پیڑ کے نیچے... فاطمہ زہرا لکھا ہے کتبے پر... اچھا! میرٹھ میں اماں کی قبر شاید بھائی شان حیدر نے مرمت کرائی ہے... ابا کی قبر پر گھاس اگ آئی ہے... یہ کس کی تازہ قبر ہے... مرتضٰی کے ابا سوئے ہوئے ہیں...... یہ برف سی کیسی گری ہے اس قبر پر... یہ کون سی جگہ ہے... یہ کس کا جنازہ چوبی تابوت میں رکھا ہے... ہوائی جہاز کی گھڑگھڑاہٹ... ہڑبڑا کر وہ اٹھ بیٹھیں... یہ کیسا عجیب خواب تھا......

تنویر زہرا بہت دیر تک دعائیں پڑھتی رہیں۔

''مرتضٰی کے ابا ہم آپ کو کراچی میں اکیلا چھوڑ آئے''۔ وہ بدبدائیں

صبح جب وہ نیچے گئیں تو خلاف معمول سب موجود تھے۔ انھیں یاد آیا کہ آج تو سنیچر ہے ،چھٹی کا دن۔ مرتضٰی نے ان کی شکل دیکھ کر کہا۔

''کیا ہوا اماں! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے، رات کو کیا نیند نہیں آئی آپ کو''۔

تنویر زہرا نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا مگر کھوئے کھوئے لہجے میں بولیں۔

''کل رضیہ کی دوست ثمینہ کا فون آیا تھا وہ بتا رہی تھی کہ صداقت مرزا کے والد کا انتقال ہو گیا، مرتضٰی! ان کو دفن کہاں کیا جائے گا؟''

مرتضٰی مسکرا کر بولے'' اماں آپ کیا اسی وجہ سے اتنی پریشان ہیں دفن ہو جائیں گے وہ قبرستان میں، مسجد والوں نے یہودیوں کے قبرستان میں کچھ جگہ خرید لی ہے وہیں دفن ہو جاتے ہیں''۔

تنویر زہرا بولیں۔''ہاں ثمینہ بھی یہی کہہ رہی تھی'' وہ تسبیح گھماتے ہوئے بولیں۔ پھر ذرا جھک کر سرگوشی کے انداز میں بولیں۔''مرتضٰی! بتا بالے، تیرے پاس 8 ہزار ڈالر جمع ہونگے؟ ورنہ ارتضٰی کو سعودی عرب فون کر کے پوچھنا کہ وہ پیسوں کا انتظام کر سکتا ہے؟''

مرتضی اور رضیہ نے چونک کر تنویر زہرا کی طرف دیکھا، دونوں تقریباً ساتھ ہی بولے۔

''کیوں اماں؟''۔

تنویر زہرا کھڑکی سے باہر گرتی ہوئی برف دیکھتے ہوئی بولیں۔

''ثمینہ بتارہی تھی کہ یہاں سے لاش پاکستان بھیجنے میں 8 ہزار ڈالر کا خرچ آتا ہے۔ اچھا! یہ بتا کہ انڈیا لے جانا کیا کچھ سستا ہوگا؟''

☆☆

بوگن ویلیا کی اوٹ سے

شکر ہے! کل رات بھر لائٹ غائب نہیں ہوئی۔ پنکھا چلتا رہا تو مچھروں سے نجات ملی۔ مدت بعد پوری رات سونا نصیب ہوا تھا، ورنہ ہر رات وہی مسئلہ تھا، ایک تو لائٹ غائب، مچھروں کی یلغار اور پھر آس پڑوس کے جنریٹر اپنی خوفناک آواز کے ساتھ چالو ہو جاتے ہیں۔ ہمارے پڑوس والے گھر میں تو شاید جنریٹر بالکل ہمارے آنگن کی دیوار کے پاس لگا ہوا ہے۔ آواز کے ساتھ ساتھ اس کا دھواں بھی ہمارے نصیب میں ہے۔

بہرحال! آج صبح بہت پیاری لگ رہی تھی۔ پوری رات کی نیند بھی کیا نعمت ہے۔ لیکن آج صبح مجھ سے اک غلطی ہوگئی۔ میں نے بے دھیانی میں اپنے کمرے کی باغیچے کے رخ والی کھڑکی کھول دی۔ وہ اپنا منحوس وجود لئے بیگ صاحب کے مکان کے سامنے اپنی پوری سفاکی سے موجود تھا۔

لاحول ولاقوۃ! میں نے جلدی سے کھڑکی بند کر دی اور مسہری کے سرہانے تکیے کے سہارے ٹیک لگا کر سامنے دیوار پر لگی خوبصورت لینڈ اسکیپ کی پینٹنگ پر نظریں جما دیں۔ یہ پینٹنگ میں نے وہاں جان بوجھ کر لگائی تھی تاکہ صبح جب آنکھ کھلے تو سب سے پہلے اس خوبصورت منظر پر نظر پڑے۔ خزاں کے موسم کی عکاسی کرتی یہ بہت خوبصورت پینٹنگ تھی جس میں چنار کے درخت نارنجی اور سرخ پتوں سے بوجھل گم سم کھڑے تھے اور نیچے ایک پہاڑی نالہ خاموشی سے بہہ رہا تھا۔ میں اس منظر میں گم ہو جانا چاہتا تھا جو یوں تو میری دسترس سے باہر تھا لیکن اس دنیا میں کہیں نہ کہیں موجود ضرور ہوگا، کم سے کم میری نظروں کے سامنے اور میرے تخیل میں تو اس لمحے موجود ہے... لیکن موجود تو کوڑے کا وہ ڈھیر بھی ہے جو بند کھڑکی سے گزر کر میرے

اوراس حسین پینٹنگ کے درمیان حائل ہوگیا ہے، وہ کوڑے کا اونچا ڈھیر عین میرے بیڈروم کی کھڑکی کے سامنے ہے۔

مجھے کھڑکی پر غصہ آنے لگا۔ کیا اس کھڑکی کا اس رخ پر کھلنا ضروری تھا۔

مجھے یاد ہے میرے آبو نے مکان میں اوپر کی منزل پر یہ کمرہ خاص طور پر اپنے لئے بنوایا تھا تا کہ وہ سکون سے پڑھ لکھ سکیں۔اک سادہ سا ہوا دار کمرہ جس میں چاروں طرف کھڑکیاں تھیں۔ پہلے مکان کے اطراف دور دور تک خالی میدان تھا، پچھواڑے کی کھڑکی سے دور ہی ''نیاز منزل'' آم کے باغ میں سے جھانکتی تھی۔ کچی، سنسان سڑک کے آخر میں جج بشیر کی کوٹھی اوراس سے ذرا فاصلے پر تھی ''امیر منزل''۔ درختوں میں چھپی یہ کوٹھیاں کسی واٹر کلر پینٹنگ کا دھندلا سا منظر معلوم ہوتی تھیں... مجھے یاد ہے کہ ابّو کے پڑھنے کی میز عین اسی کھڑکی کے نیچے ہوتی تھی۔ وہ ہمیشہ کھڑکیاں کھول کر سوتے تھے، بند کمروں سے ابّو کو وحشت ہوتی تھی۔ چند برس پہلے تک میرا بھی یہی حال تھا، جب تک یہ بھیانک کوڑے کا ڈھیر میرے گھر کے سامنے نمودار نہیں ہوا تھا۔

ہمارے گھر کے اطراف نئے مکانوں کا سلسلہ شروع ہوا تو پھر رک نہیں پایا۔ دیکھتے دیکھتے خالی میدان مکانوں سے بھر گیا... مجھے پھر غصہ آنے لگا، آخر بیگ صاحب کو یہاں مکان بنوانے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ رہتے تو ہیں نہیں کبھی اس مکان میں... گورنمنٹ کی نوکری سے ریٹائر ہونے کے بعد سب مسلمانوں کو علی گڑھ آنے کی ہی کیوں سوجھتی ہے... مکان مکمل ہونے سے پہلے ہی ان کی بیوی چل بسیں لہٰذا بیگ صاحب بمشکل چند مہینے یہاں رہے ورنہ کبھی مہینوں کے لئے بیٹے کے پاس چلے جاتے ہیں یا بیٹی سے ملنے روانہ ہو جاتے ہیں... ایک تو نہ جانے کیسا بے ہنگم مکان بنوایا ہے، ایک مستطیل ڈبہ جیسا مکان جس کے سامنے ایک تکونہ زمین کا ٹکڑا دیوار سے گھیر دیا گیا ہے۔ شاید تکونہ لان بنوانے کا ارادہ ہو۔ اس تکونے بے تکے لان میں ایک لوہے کا پھاٹک بھی ہے جس میں ہمیشہ اک موٹا سا زنگ آلود تالا پڑا رہتا ہے۔ جب کبھی بیگ صاحب گھر میں مقیم ہوتے ہیں تو آمد و رفت صحن کے پچھلے دروازے سے ہوتی ہے۔ ویسے بھی ان کے یہاں آتا جاتا ہی کون ہے۔

اب ہمارا محلّہ ''سرسید نگر'' کہلاتا ہے۔ ہر خالی پلاٹ پر مکان بن چکے ہیں۔ اور جب گھروں کا کوڑا پھینکنے کے لئے کوئی جگہ نہیں بچی تو بیگ صاحب کا تکونہ لان دھیرے دھیرے

اجتماعی کوڑے دان بنتا گیا۔ بیگ صاحب کی غیر موجودگی محلے والوں کے لئے نعمت ثابت ہوئی ۔پچھلے سال وہ چند ہفتوں کے لئے بیٹے کے پاس سے آئے تھے تو اپنے گھر کے سامنے کوڑے کا یہ ڈھیر دیکھ کر خوب واویلا مچائی ۔ محلے کے معتبر لوگوں سے ملے، مگر ان کی سنتا کون ہے۔ اکیلے، ضعیف آدمی جو ٹھیرے۔

مجھے خود پر غصہ آنے لگا، ارے پروفیسر ثاقب! تم سمجھتے کیا ہو خود کو...لوگوں نے آپ سے میونسپل کمیٹی کا الیکشن لڑنے کے لئے کہا تو آپ غصہ ہو گئے۔

''میں ان لونڈوں لپاڑوں کے مقابلے الیکشن لڑوں۔ لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہوگا... ثاقب صاحب کا نشان ''سائیکل'' ہے سائیکل کو کامیاب بنایئے۔اور اگر بفرض محال میں الکشن جیت بھی گیا تو وہاں میونسپل کمیٹی میں بنیئے اور ٹھیکیداروں کے ساتھ سر کھپاؤں گا......لاحول ولاقوۃ۔''

ٹھیک ہے پروفیسر صاحب... میں نے خود سے کہا، تو اب ماریئے جھک بند کھڑکی کے پیچھے۔ یا یونیورسٹی میں ان لڑکے لڑکیوں کو اردو ادب پڑھایئے جنھیں کم نمبروں کی وجہ سے کسی اور مضمون میں ایم اے کرنے کے لئے داخلہ نہیں مل سکا۔ آپ کو کیا غرض اپنے اطراف پھیلے کوڑے کی ڈھیریوں سے۔کھلی ہوئی نالیوں سے۔ آپ تو انٹلیکچوئل ہیں......

میں خود سے الجھتا ہوا نیچے اتر آیا۔ برآمدے میں چائے کی ٹرے میرا انتظار کر رہی تھی۔ میری پسندیدہ گرین لیبل چائے کی خوشبو، میری مخصوص نازک چینی کی پیالیاں، امّی کے ہاتھ کی کڑھی ہوئی ٹی کوزی، یہ مانوس چیزیں دیکھ کر میرے دل کو ذرا قرار آ گیا۔ میں اپنی چائے کی پیالی اور اخبار۔ لے کر لان میں نکل آیا۔ آج اتوار کا دن تھا، سڑک پر ٹریفک کی آواز بھی کم تھی۔ ستمبر کی یہ صبح کافی پرسکون لگ رہی تھی ... کیاریوں میں لگے پھول، ہموار گھاس، دیوار پر چڑھی بوگن ویلیا کی بیلیں، یہ تو میری دسترس میں ہیں... پچھلے کئی برسوں سے میں اپنا زیادہ تر وقت اسی لان کی دیکھ بھال میں صرف کرتا ہوں۔ ایک پارٹ ٹائم مالی بھی آتا ہے۔ صبح شام میں اسی لان میں ٹہلتا ہوں۔ گھر کے باہر ٹہلنے کی اب کوئی جگہ بھی تو نہیں ہے۔ جاؤں تو جاؤں کہاں۔

مجھے ابّو کی یاد آنے لگی۔ وہ بتاتے تھے کہ سستے زمانے میں انھوں نے تین ہزار گز زمین لے کر ڈال لی تھی۔ جب یہ جگہ بالکل ویرانہ تھی ۔ یونیورسٹی کے اطراف میں آبادی تھی ہی نہیں۔ اسی لئے یہ زمین ڈیڑھ روپے گز مل گئی تھی، ابّو کے وسائل محدود تھے، یونیورسٹی کے استاد کو

تنخواہ ہی کتنی ملتی تھی اس زمانے میں۔ زمین تو ابو نے خرید لی تھی لیکن مکان بنانے کیلئے یونیورسٹی سے قرض لینا پڑا تھا... انھوں نے اک چھوٹا سا، ہوادار، سادہ سا مکان بنایا تھا۔ سامنے کی خالی زمین پر ابو نے گل مہر، نیم، املتاس وغیرہ کے درخت لگادیئے تھے۔ یہ درخت ہم بہن بھائیوں کے ساتھ ہی پل کر جوان ہوئے تھے۔ اب یہ پورے معتبر درخت ہوگئے ہیں۔ اور اب میرے سر کے آدھے سے زیادہ بال بھی تو سفید ہوگئے ہیں... میں نے خالی زمین کے ایک چھوٹے سے حصے کو مہندی کی باڑھ لگا کر ایک لان کا روپ دے دیا تھا۔ باقی حصہ یوں ہی پڑا رہتا تھا۔ نیم، املتاس، اور گل مہر کے درختوں کے نیچے محلے کے بچے آکر کھیل لیا کرتے ہیں۔ تین ہزار گز زمین کے اطراف چہار دیواری بنوانا میرے مالی وسائل میں ممکن نہیں تھا اس لئے میں نے لوہے کے کانٹے دار تاروں کی باڑھ لگوادی تھی اور ایک چھوٹا سا لکڑی کا پھاٹک بھی لگوادیا تھا جو میرے اور باہر کی دنیا کے درمیان حد بندی کرتا تھا۔ محلے کے بچوں نے کانٹے دار تاروں کو موڑ کر اپنے آنے جانے کا راستہ خود بنالیا تھا میں ان بچوں کے مداخلت کو نظر انداز کر دیتا ہوں... آخر یہ بچے اب کھیلیں تو کہاں کھیلیں... میری بیگم اکثر غصہ ہوجاتی ہیں کہ کیا مصیبت ہے، ہمارا ہی گھر رہ گیا ہے چوپال بننے کے لئے۔

مجھے یاد ہے!... بچپن میں ہم لوگ دن کا زیادہ حصہ گھر کے باہر ہی گذارا کرتے تھے ...گلی ڈنڈا، کرکٹ، پتنگ بازی، درختوں پر چڑھنا، چاندنی راتوں میں آنکھ مچولی، کیا کیا نہیں ہوتا تھا۔ ہمارے بچپن میں ہی تھوڑی دور پر اِکا دُکا کوٹھیاں بننا شروع ہوگئیں تھیں، سڑک تب بھی کچی ہی تھی۔ خوب دھول اڑا کرتی تھی، درختوں کے نیچے باجی ہنڈکلیا پکاتی تھیں۔ میری بیٹی تو شاید جانتی بھی نہیں ہنڈکلیا کیا ہوتی ہے، اس کا زیادہ تر وقت تو انٹرنٹ اور T.V. کے سامنے گذرتا ہے۔

مجھے بے اختیار باجی کی یاد آنے لگی... تین سال ہوگئے ان سے ملے ہوئے۔ پچھلی بار جب وہ چھ سال بعد امریکہ سے آئی تھیں تو انہیں اپنے شہر کا بدلا ہوا نقشہ دیکھ کر کیسا شاک لگا تھا۔ مکان ہی مکان۔ آبادی ہی آبادی۔ ہر طرف شاپنگ سینٹر، نالیاں، کیچڑ۔ وہ ''امیر منزل'' کے سامنے لگے پرانے پیپل کے درخت کو ڈھونڈ رہی تھیں جس کی نیچے سے گذرتے ہوئے بچپن میں وہ ڈرا کرتی تھیں کیونکہ سنتے تھے کہ پیپل پر چڑیل اور پچھل پیریاں رہتی ہیں۔ باجی ''امیر منزل'' والے نواب صاحب کی پوتی کے ساتھ کھیلنے جاتی تھیں جو ان کی ہم جماعت تھی۔

آج کتنے دن کے بعد "امیر منزل" والے نواب صاحب یاد آ گئے۔ان کی پر رعب شکل، وضع قطع، گرج دار آواز، بڑی بڑی مونچھیں اور ان کے پورٹیکو میں کھڑی پرانی فورڈ جو کبھی چلتی نہیں تھی، ان کے گول ڈرائنگ روم میں سجی تلواریں، قالین اور شیر کا سر ہمارے لئے افسانوی چیزیں تھیں۔نواب صاحب کا پوتا جب چھٹیوں میں دہرہ دون کے اسکول سے آتا تھا تو ہم لوگ اس کے ساتھ "کاوبوائے" کا کھیل کھیلتے تھے، وہ بھی سنا ہے اب امریکہ میں آباد ہے۔

ہاں...تو جب باجی پچھلی بار امریکہ سے آئی تھیں تو پوچھ رہی تھیں۔

"بھیا مکانوں اور دکانوں کے اس جنگل میں وہ گھنا پیپل کا پیڑ نظر نہیں آتا جو "امیر منزل" کے گیٹ کے پاس تھا"۔

"تم پیپل کا پیڑ ڈھونڈ رہی ہو باجی" میں نے آہستہ سے کہا تھا......"امیر منزل ہی اب کہاں ہے"۔

"امیر منزل کہاں گئی"؟

میں نے سامنے لگے ہوئے بورڈ کی طرف اشارہ کیا تھا جس پر "امیر منزل بلڈنگ کامپلیکس" کا بورڈ لگا ہوا تھا اور نیچے زیر تعمیر فلیٹوں کا نقشہ بنا ہوا تھا۔امیر منزل ختم ہو چکی تھی۔ فلیٹوں کی بنیادیں کھد چکی تھیں اور چاروں طرف لوہے کے سریئے، اینٹیں اور مزدوروں کی جھگیاں بکھری ہوئی تھیں۔سیکڑوں کی تعداد میں بہاری مزدور آ کر ہمارے شہر میں بس گئے ہیں۔

باجی کے چہرے کی وحشت مجھے آج تک یاد ہے۔ میں باجی کو کیا بتاتا کہ پورے تین مہینے یونیورسٹی آتے جاتے میں نے "امیر منزل" کو کیسے آہستہ آہستہ معدوم ہوتے دیکھا ہے۔ آخیر میں ڈرائنگ روم والا پتھر کا آتشدان توڑنے میں سنا ہے مزدوروں کو بہت مشکل ہوئی تھی ...وہی آتشدان جس کے اوپر لگا شیر کا سر دیکھ کر ہم بچپن میں ڈر جاتے تھے۔

مجھے خیال آیا کہ پچھلے ہفتے باجی کا خط آیا ہے امریکہ سے، کہ وہ اس سال دسمبر میں ہندوستان آئیں گی...اور اس بار عین ہمارے گھر کے سامنے یہ تکونہ، بے ہودہ کوڑے دان اُن کا استقبال کرے گا۔ بلا ارادہ میری نظریں سڑک کی طرف اٹھ گئیں۔سڑک کے پار کوڑے کا ڈھیر اب جاگ گیا ہوگا۔ میں نے اپنے گھر اور سڑک کے درمیان بوگن ویلیا کی بیلیں ایک لوہے کے جنگلے پر چڑھا کر پھولوں کی اک دیوار سی بنا دی تھی تا کہ صبح و شام ٹہلتے وقت اس دیوار کے پیچھے جو

بھی ہورہا ہو وہ میری نظروں سے اوجھل رہے۔بیل میں گھرے عنابی پھول شبنم میں ڈوبے ابھی جاگ ہی رہے تھے۔اف...وہ کوڑے کا ڈھیر بھی اب جاگ گیا ہوگا۔جھگیوں میں رہنے والے مزدوروں کے بچے اس ڈھیر پر سے پلاسٹک کی تھیلیاں چن رہے ہونگے .... مجھے خیال آیا۔

مجھے اس خیال نے پھر اک بار بے چین کردیا... یہ بدتمیز، اڑیل، بدوضع پلاسٹک کی تھیلیاں ہر جگہ موجود ہیں آج کل، دکانوں میں، سڑکوں پر، گھروں میں ہر جگہ موجود ہیں یہ ...میں دوکاندار سے الجھ پڑتا ہوں کہ کیوں اتنی زیادہ پولی تھین کی تھیلیاں برباد کرتے ہو...میری بیگم کہتی ہیں کی میں جھکی ہوگیا ہوں، وہ کہتی ہیں کہ اگر میرا بس چلے تو میں ان کے ہاتھ میں گنوارو، پرانے فیشن کا کپڑے کا تھیلا دے کر شاپنگ کرنے بھیج دوں... ہاں اگر میرا بس چلے تو...وہ کہتی ہیں کہ آپ نے کیا ٹھیکہ لے رکھا ہے ہر مسئلے کا...ٹھیک ہی تو کہتی ہیں بیگم۔

میرے پھاٹک کے سامنے اک نئی، لال رنگ کی ماروتی زین کار آکر رک گئی اور اسمیں سے ٹھیکے دار سمیع اللہ صاحب اور ان کے ساتھ ایک صاحب سفید چمکیلے سوٹ میں ملبوس اترے۔

''اسلام علیکم ڈاکٹر صاحب'' سمیع اللہ نے دور سے آواز لگائی۔

''چہل قدمی ہورہی ہے باغیچے میں، بہت ٹھیک ٹھاک جگہ بنائی ہے آپ نے'' انھوں نے قریب آکر کہا۔

میرے لان کی تعریف ''ٹھیک ٹھاک'' کہہ کر ٹھیکے دار سمیع اللہ ہی کرسکتے ہیں۔میں نے سوچا۔

''آپ سے ملیئے آپ ہیں عبدالباری صاحب'' سمیع اللہ نے دوسرے حضرت کا تعارف کرایا۔برسوں سے دبئی میں ہیں یہاں آکر سیٹل ہونے کا ارادہ ہے...بڑی پارٹی ہیں''۔

عبدالباری صاحب نے انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ بڑھا کر مصافحہ کیا۔میں نے اندر چل کر بیٹھنے کے لئے کہا تو وہ بولے۔

''یہیں باہر بیٹھتے ہیں اچھی جگہ ہے''۔

''شکریہ'' میں خوش ہوگیا۔''یہ دیکھئے میں نے گلاب کی اک خاص ورائٹی منگوا کر لگائی ہے۔باغبانی اور باغیچہ ہی اب میری زندگی ہے''۔میں نے کہا۔

عبدالباری صاحب نے لان میں پڑی بید کی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''صاحب یہی تو بات ہے۔آپ تو سمجھئے سونے کی کان پر بیٹھے ہیں''

میں اس جملے کے کاروباری پن میں ہی الجھا ہوا تھا اور وہ کہے جا رہے تھے۔

''آجکل آپ کے علاقے میں زمین تو سونے کے بھاؤ ہے یہی زمانہ ہے لوگ اپنی قسمتیں بنا رہے ہیں''۔

''کس کی؟'' میں چپ نہ رہ سکا ''اپنی قسمت یا زمین کی قسمت''۔

''ہا،ہا،ہا!'' قہقہ لگاتے ہوئے باری صاحب بولے۔

''خوب! آپ ادبی لوگ بھی بات کو کیا سے کیا بنا دیتے ہیں''۔

''ڈاکٹر صاحب'' سمیع اللہ ذرا سرگوشی کے لہجے میں جھک کر بولے۔

''آپ تو سمجھئے لکھ پتی ہیں۔اس علاقے میں جس کے پاس زمین ہے وہ تو سونے کی کان پر بیٹھا ہوا ہے۔اتنی بہت سی فالتو زمین پڑی ہے آپ کے گھر کے اطراف۔عبدالباری صاحب مارکیٹ سے زیادہ دام دینے کو تیار ہیں کیونکہ موقع کی زمین ہے''۔

مجھے یقین سا نہیں آیا سمیع اللہ یوں بے دھڑک سودے کی بات کر ڈالیں گے میں نے غصہ ضبط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے نارمل آواز میں پوچھا۔

''گویا آپ میرا گھر خریدنے آئے ہیں''۔

باری صاحب فوراً بولے۔

''ہاں اگر زمین کے ساتھ اپنا مکان بھی فروخت کرنا چاہیں تو واہ! واہ...بلکہ یہی بہتر ہوگا، میں اس کے بدلے بلڈنگ کامپلکس میں آپ کو بہترین فلیٹ دوں گا...آپ نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔''

''تشریف لے جایئے'' غصے کے مارے میرے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

''آپ دونوں کی ہمت کیسے ہوئی میرے گھر کے دام لگانے کی''۔

عبدالباری صاحب سے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔''صاحب ہم تو آپ کے بھلے کی بات کر رہے تھے۔مارکیٹ سے ڈبل پیسے دے دیں گے۔''

سمیع اللہ نے عبدالباری کا ہاتھ پکڑا اور کار کی طرف چل پڑے عبدالباری کی آواز میرے کانوں میں آئی۔

''یہی تو وجہ ہے ہماری قوم ترقی نہیں کرتی''۔

''اجی چھوڑیئے'' یہ ٹھیکیدار سمیع اللہ کی آواز تھی۔

''دبائے بیٹھے رہیں اپنی زمین ڈاکٹر صاحب۔ سامنے والا تکونہ کوڑے دان تو اب بھر چکا ہے اور شاید بیگ صاحب نے یہ جگہ بیچ بھی دی ہے۔ کوڑے دان کے لئے اب ڈاکٹر صاحب کے ہی احاطے کی باری ہے اور کوئی خالی جگہ تو بچی نہیں آس پاس''۔

☆☆

الٰہی یہ جلسہ کہاں ہو رہا ہے

مجھے امام باڑے تک پہنچنے میں کافی دیر ہوگئی تھی آج سیٹر ڈے نائٹ تھی اور وہ بھی گرمی کے موسم میں ،لہٰذا ٹریفک بہت تھا اور مزید مصیبت یہ ہوئی کہ جس راستہ سے مجھے آنا تھا وہ (Forum) فورم اسٹیڈیم کے سامنے سے ہوکر گذرتا تھا، آج فورم میں شاید کسی مشہور سنگر کا کا نسرٹ تھا ٹریفک اور بھیڑ کی انتہا ہوگئی تھی ۔پون گھنٹے کا راستہ پورے ڈیڑھ گھنٹے میں طے ہوا اور پھر بھلا ہو میرے بھلکڑ پن کا...جس سڑک پر امام باڑہ تھا اس کا نام بھول گئی ...ایک تو مانٹریال کی ساری سڑکوں کے نام مشہور فرانسیسی جرنلس اور دیگر شخصیات سے منسوب ہیں خدا خدا کر کے نام یاد آیا... lionel-Groux...نہ جانے کیسے کیسے ٹیڑھے نام ہیں...ارے ہوگا کوئی ان کا فرانسیسی ہیرو مجھے کیا...بہر حال تھوڑا ادھر اُدھر بھٹک کر مجھے امام باڑہ مل ہی گیا۔

اب میرے سامنے مسئلہ یہ تھا کہ کار کہاں پارک کی جائے ۔آج محرّم کی آٹھ تاریخ تھی ،بہت سے لوگ مجلس میں آئے ہونگے ۔ہر طرف کاریں پارک تھیں ۔بمشکل کافی دور پارکنگ کی اک جگہ ملی وہیں میں نے کار لگادی ۔یہ ورکنگ کلاس اٹالین لوگوں کا محلّہ تھا۔تین سال ہوئے یہاں امام باڑے کے لئے ایک عمارت خریدی گئی تھی، اک پرانا Ware House تھا جس کی مرمت کروائی گئی تھی ۔کمیونٹی کے لوگوں نے خوب دل کھول کر چندہ دیا تھا۔

امام باڑے کے اندر گھستے ہی حلیم کی خوشبو اور مرثیئے کی آواز نے میرا استقبال کیا۔ اپنے بیٹے علی کو میں نے مردانے ہال کا راستہ دکھایا اور خود زنانے ہال میں آگئی ، ہال پورا بھرا ہوا تھا۔دوراازے کے قریب ہی مسز جعفری اور زہرہ آپا بیٹھی تھیں ان کے نزدیک ایک ایرانی بڑی بی سر جھکائے تسبیح پڑھ رہی تھیں ۔میں نے وہیں اپنے لئے جگہ بنالی ۔ جان پہچان والیوں سے

اشارے میں سلام ودعا کے بعد جب ذرا سکون سے بیٹھی تب تک مرثیہ ختم ہو چکا تھا۔ آج کوئی بڑی اچھی سوز خوانی کرر ہا تھا۔

ہال میں دو T.V.Monitor لگے ہوئے تھے جس پر مردانے ہال سے ویڈیو کیمرے کے ذریعے مجلس نشر کی جاتی تھی۔ .T.V اسکرین پر اب مرثیے خوان تخت پر سے اترتے نظر آرہے تھے اور کیمرہ مولانا پر فوکس کیا جارہا تھا۔ کالی عبا اور سبز عمامہ پہنے مولانا نے منبر پر بیٹھنے کے بعد جب مجلس شروع کی تو میں فوراً سمجھ گئی کہ کوئی گجراتی بولنے والے خوجہ مولانا ہیں۔ حالانکہ وہ بیچ بیچ میں اردو کے بہت ثقیل الفاظ بھی استعمال کررہے تھے۔

زہرہ آپا نے اپنے خیال میں سرگوشی کی جو خاصی بلند آواز میں تھی۔

''اے ہے! یہ آٹھ تاریخ کس ''سوچھے، سوچھے'' کرنے والے کو منبر پر بیٹھا دیا۔ اچھے بھلے ہر سال حسنین رضوی عشرہ پڑھتے تھے''۔

مسز جعفری نے انہیں ٹھوکا دیا۔

''خدا کے لئے زہرہ آپا! ذرا آہستہ بولئے۔ مولانا اس سال لندن سے آئے ہیں مجلس پڑھنے۔ مسز فقیرانی نے خاص طور پر بلوایا ہے''۔ پھر انھوں نے میرے کان میں کہا۔

''امام باڑہ کمیٹی کی میٹنگ میں طے ہوا تھا کہ دو دن تو کچھی زبان میں مجلس پڑھی جائے گی اور باقی دن اردو میں۔ بلکہ ان مولانا نے تو کل شروع میں تھوڑی دیر مجلس انگریزی میں بھی پڑھی تھی تا کہ ہمارے بچے بھی اپنے مذہب کے بارے میں کچھ جانیں''۔

زہرہ آپا باز آنے والوں میں سے نہیں تھیں، بولیں۔

''توبہ ہے! اب کم سے کم انگریزی میں نوحے تو نہ پڑھوانا۔ سال بھر اسی انتظار میں رہتے ہیں کہ ذرا محرم میں اردو سننے کو ملے گی''۔

نزدیک ہی بیٹھی زینت پیرانی نے ہمیں گھور کر دیکھا۔ ہم سہم کر بیٹھ گئے۔ میں نے مجلس کی طرف دھیان دینے کی کوشش کی۔

مولانا کہہ رہے تھے۔

''یہ ننگے سر، نیم عریاں لباسوں میں کیا جناب فاطمہ زہرا کی کنیزیں ہیں؟ مومنوں قیامت کے روز خدا انہیں پوچھے گا کہ کتنے ڈالر کمائے... حضرت علی نے فرمایا تھا کہ دنیا کی وقعت

میری نظر میں بکری کی اک چھینک سے زیادہ نہیں..."

میری توجہ پھر بھٹک کر ہال میں بیٹھی خواتین کی طرف آ گئی۔تقریباً سارے چہرے مانوس تھے۔عورتیں کالے دوپٹوں اور ساڑھیوں کے آنچل سے سر ڈھکے بیٹھی تھیں۔سامنے اک صاحبہ جارجٹ کے کالے دوپٹے سے سر ڈھکے، دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ان کا چہرہ تو دیکھا بھالا لگتا تھا مگر نام مجھے نہیں معلوم تھا۔میں نے مسز جعفری سے پوچھا کہ یہ کون ہیں تو انھوں نے آہستہ سے بتایا "یہ زیبا ہیں، ابھی اسی سال ٹورانٹو سے یہاں آئی ہیں۔یہاں بینک میں کام کرتی ہیں"۔

مجھے یاد آ گیا کہ کہاں دیکھی تھی یہ شکل۔انھیں تو میں نے اکثر رائل بینک میں دیکھا تھا۔وہاں اسکرٹ اور بلاوز میں ملبوس یہ کسی حد تک spanish نظر آئی تھیں مگر آج شلوار قمیص اور کالے دوپٹے میں کتنی مختلف لگ رہی تھیں۔تھوڑی ہی دور پر اک نیلی آنکھوں والی فرنچ کنیڈین لڑکی بیٹھی تھی، کالے اسکارف سے سر ڈھکے بڑی عقیدت سے سر جھکائے مجلس سُن رہی تھی۔زہرا آپا جو شہر خبر و تھیں انھوں نے ہی بتایا کہ ایک پاکستانی طالب علم کی بیوی ہے۔چند مہینے پہلے شادی ہوئی ہے۔پہلے یہ کیتھرین تھی اب فرحانہ نام رکھا گیا ہے۔میں نے سوچا کہ اپنی تعلیم ختم کر کے اگر یہ لڑکا اسے چھوڑ کر پاکستان بھاگ گیا اپنی کسی کزن سے شادی کرنے تو کیا فرحانہ پھر سے کیتھرین بن جائے گی۔

میں نے پھر مجلس کی طرف دھیان دینے کی کوشش کی۔مولانا صاحب بہت جوش میں بول رہے تھے۔وہ اب مسئلہ خلافت کے بارے میں بیان کر رہے تھے۔صلوٰۃ کے نعرے بلند ہو رہے۔ٹی وی اسکرین سے ہٹ کر میری نظر دیوار پر گئی جہاں امام خمینی اور امام خوئی کی تصویروں کے نیچے فرنچ اور انگریزی میں فائر ڈیپارٹمنٹ کا ایک نوٹس لگا تھا۔

"اس عمارت میں بہ یک وقت ڈیڑھ سو سے زیادہ لوگوں کا جمع ہونا منع ہے۔آگ لگنے کا خطرہ ہوسکتا ہے"۔

میں نے سوچا کہ اس وقت یہاں تقریباً چار سو لوگ جمع ہوں گے اگر پولیس آ جائے تو کیا ہوگا۔پھر مجھے یاد آیا کہ چند برس پہلے جب تک امام باڑے کی بلڈنگ نہیں خریدی گئی تھی تب محرّم کی مجالس اک اسکول کے جمنیزیم میں ہوتی تھیں۔وہ محرم کی دس کی تاریخ تھی جب وہاں ایک بار پولیس آ گئی تھی، شاید محلے والوں نے ماتم اور رونے کی آوازیں سنی ہوں گی تو پولیس کو اطلاع دی تھی۔

پولیس آفیسر نے آ کر دیکھا، بات چیت کی اور جب پتہ چلا کہ اک مذہبی اجتماع ہے تو پولس آفسر نے بس اتنے زیادہ لوگوں کے جمع ہونے پر بہت تمیز سے تنبیہ کی تھی اور چلا گیا تھا...نہ ہوا ہمارا ملک ورنہ پولیس والے بدتمیزی کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے یا رشوت لے کر ہی ٹلتے۔

اس وقت ہال میں آہ وبکاء کا شور ہو رہا تھا مولانا مصائب بیان کر رہے تھے اور زانو پیٹ رہے تھے۔

''ارے بیٹا علی اکبر اٹھو...ارے پھپّی زینب خیمے سے پکارتی ہیں...ارے جوان بیٹے کا پامال شدہ لاشہ کیسے دیکھے گا بوڑھا باپ...ارے علی اکبر اٹھو اذان دو...اٹھو بیٹا...''

نہ جانے میرے کم بخت دماغ میں کیسے کیسے خیال آتے ہیں بے وقت۔ اک دم بابری مسجد کا ملبہ آنکھوں میں پھر گیا...کون تھی وہ...سادھوی...کیا نام تھا اس کا...رتھمبرا...کیسے نعرے لگا رہی تھی۔

''ایک دھکا اور دو، بابری مسجد توڑ دو''۔

وہ عصر کی نماز کا ہی وقت ہوگا...میں نے T.V. پر دیکھا تھا کہ نعرے لگ رہے تھے...مندر یہیں بنائیں گے...جے شری رام کی...گیروے رنگ کا طوفان تھا جس نے اس قدیم مسجد کو شہید کر دیا تھا۔

اب ہال میں ''یا حسین''''یا حسین'' کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ کالے کپڑے پہنے لوگ حلقہ در حلقہ کھڑے ہو گئے تھے۔ T.V. اسکرین آف ہو گیا تھا اور مردانے ہال سے قاسم صاحب کی پاٹ دار آواز ابھری۔ انھوں نے نوحہ شروع کیا۔

''وہ خون ناحق چھپے گا کیوں کر جسے یہ دنیا چھپا رہی ہے''۔

اندر کے ہال میں عورتوں نے ماتم کے لئے حلقہ باندھ لیا تھا۔ میری دوست سکینہ کی بچیوں نے اپنی چھوٹی چھوٹی آوازوں میں نوحہ شروع کیا۔ وہ کاغذ سے دیکھ دیکھ کر اٹک اٹک کر پڑھ رہی تھیں۔ میں نے اُچک کر دیکھا انگریزی حروف میں اردو کا نوحہ لکھا ہوا تھا۔ اس کے بعد مسز سجاد کی نمبر تین بہو نے پرسوز آواز میں نوحہ شروع کیا۔ وہ تھوڑے دن پہلے لکھنؤ سے بیاہ کر آئی تھی، وہ پڑھ رہی تھی۔

صدا ہے بن میں کسی ماں کی دل دکھائی ہوں
میں اپنے شیر کو جنگل میں لینے آئی ہوں

اس نوحے نے میرے ذہن و دل میں کتنی یادوں کے دریچے کھول دیئے...امروہے کا امام باڑہ ...پھوپھی اماں کی پرسوز آواز ...دُلدُل اندر آنگن میں آیا ہے تاکہ عورتیں زیارت کرلیں۔ بڑی بوڑھیاں حلقہ باندھے سر کا ماتم کر رہی ہیں...سب کچھ میلوں دور...برسوں دور... آپ ہی آپ میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔

اب ہال میں خوجہ خواتین کا گروپ ماتم کے لئے حلقہ زن تھا، عورتیں ایک دوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے حلقے میں گھوم گھوم کر ماتم کر رہی تھیں۔ خاص لے اور تال کے ساتھ وہ نام بنام شہیدانِ کربلا کو پرسہ دے رہی تھیں۔

''پُرسے کے لئے آئے ہیں ہم فاطمہ زہرا...شبیر کا پُرسہ...عباس کا پرسہ...''

آج امام باڑہ میں بہت بھیڑ تھی۔ بہت سے لوگ اپنی منتیں اتارنے آئے تھے۔ مسز مہدی نے حضرت عباس کا علم چڑھایا تھا۔ مہدی صاحب جو جنگی جہاز بنانے والی ایک امریکن کمپنی Prett & Wittney میں کوالٹی کنٹرول انجینئر تھے۔ سنا تھا کہ ان کی کمپنی کافی لوگوں کو برطرف کرنے والی تھی۔ مہدی صاحب کی باری ابھی نہیں آئی تھی، اسی لئے مسز مہدی نے علم چڑھایا تھا۔ مسز جعفری اپنے چھوٹے سے پوتے کو منت کا ہرا کرتا پہنا رہی تھیں۔ زیدی صاحب کی چھوٹی بہو ماتم کرتے کرتے بے ہوش ہوگئی۔

زہرا آپا نے سرگوشی کی۔

''سنا ہے بے چاری اپنے میاں اور ساس کے ہاتھوں بہت پریشان ہے۔''

ماتم اور نوحوں کا سلسلہ جاری تھا مجھے اپنی بیٹی کو لائبریری سے لینا تھا جو وہاں اپنے امتحان کی تیاری کر رہی تھی۔ اس کا یہ انجینئرنگ کا آخری سال ہے۔ علی باہر مردانے ہال کے دروازے پر میرا انتظار کر رہا تھا۔ باہر کے دروازے پر تبرک بانٹنے والوں کی بھیڑ بھی۔ آج بہت سے لوگ تبرک تقسیم کرنے کے لئے لائے تھے۔ سموسے، چاکلیٹ، Donuts اور نہ جانے کیا کیا جمع ہوگیا تھا میرے اور علی کے پاس۔

مسز فقیرانی آج لمبے لمبے پلاسٹک کے گلاسوں میں آئس کریم بانٹ رہی تھیں۔ علی تو بہت خوش ہوا۔ انھیں پہچان بھی گیا مجھ سے بولا۔

''Mom یہ وہ ہی آنٹی ہیں، نا! جن کی Swenson آئس کریم کی دوکان ہے۔ یہ

آنٹی تو وہاں کیش رجسٹر پر کھڑی ہوتی ہیں"۔

مسز فقیرانی مسکرا کر بولیں۔

"ہاں بیٹا۔ مولا کے کرم سے ہی Swenson کی رونق ہے۔" انھوں نے خوش ہو کر علی کو دو گلاس پکڑا دیئے۔

مسز نصیر الحق پلاسٹک کے ڈبوں میں بند حلیم سب کو تھما رہی تھیں۔

جب ہم تبرکات سے لدے پھندے باہر نکلے تو رات کے ساڑھے دس بج چکے تھے، موسم خوشگوار تھا۔ محلے کے اٹالین لوگ اپنے گھر کے سامنے کی سیڑھیوں پر یا بالکنی میں بیٹھے تھے۔ اکثر مردوں نے صرف نیکر اور بغیر آستین کی ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ عورتیں بھی شارٹس یا کندھوں سے عریاں گرمی کے لباس میں تھیں۔ سب کے ہاتھوں میں بیئر کے گلاس تھے۔

سامنے سے آتا ہوا ایک بوڑھا جو نشے میں دھت لگتا تھا مجھ سے ٹکرا گیا۔ کاغذ میں لپٹی بیئر کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھی۔ بڑے میاں نے سر سے ہیٹ اتار کر مسخرے انداز میں سینے پر رکھا اور جھک کر فرنچ میں بولا۔

"سوری مادام... ایک سِپ آپ جیسی خوبصورت خاتون کے لئے"

اور اس نے منہ سے بیئر کی بوتل لگائی۔ باقی ماندہ بیئر اس نے غٹاغٹ گلے میں انڈیل لی۔

گاڑی کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ ہماری گاڑی سے ٹیک لگائے ایک نوجوان جوڑا دنیا سے بے خبر، ایک دوسرے میں کھویا ہوا Kiss کر رہا تھا۔ ہماری آہٹ سن کر دونوں نے سر اٹھایا، لڑکے نے انگریزی میں کہا۔

"کتنی خوبصورت رات ہے"۔

دونوں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ ہلکا سا اک Kiss کیا اور چل دیئے۔

میرے دس سالہ بیٹے علی نے مسکرا کر فرانسیسی انداز میں کندھے اچکائے اور گاڑی میں بیٹھ گیا۔

گاڑی اسٹارٹ کرتے وقت میں نے سوچا کہ گھر پہنچ کر سونے سے پہلے شاور لینا پڑے گا تاکہ بالوں اور جسم سے حلیم، سموسوں اور مسالوں کی بو نکل جائے صبح آفس بھی تو جانا ہے۔

☆☆

چمکیلی تصویریں

اف! یہ گلیاں اپنی پُر پیچ کیوں ہیں۔نالیوں میں اتنی سڑن کیوں ہے۔گلی میں آتے جاتے لوگوں کے چہرے دھواں دھواں کیوں ہیں۔یہ جس رکشہ پر بیٹھی ہوں اتنا بوسیدہ اور خستہ حال کیوں ہے... عفت خود ہی خود الجھی جارہی تھی۔

رکشہ گھر کے دروازے پر رکا، آنگن کے دوازے کا پردہ خاصا بدرنگ ہو چکا تھا۔عفت اندرداخل ہوئی۔اماں برآمدے میں چارپائی پر بیٹھی ترکاری کاٹ رہی تھیں، سلیمہ چھوٹے سے باورچی خانے میں بیٹھی بُرادے کے انگیٹھی پر روٹیاں پکارہی تھی۔ابا کمرے کی چق ہٹا کر باہر آئے پپو، چنو اور نشو نے آکر گھیر لیا ''باجی آگئیں۔عفت باجی آگئیں''۔

عفت کا جی اُمڈ آیا... ابا کتنے کمزور ہوگئے ہیں... عجیب بے رونقی سی چھائی ہوئی تھی گھر پر... نہ جانے یہ بجلی کی Voltage کم آنے کی وجہ سے تھی یا خود عفت کے دل میں زیرواٹ کا بلب جل رہا تھا۔

شام کے چھ بجے تھے... اس نے آنکھیں بند کر کے سوچا... اس وقت چچی جان کے گھر دہلی میں کیا ہورہا ہوگا؟... بشیر نے لان پر بید کی کرسیاں لاکر رکھی ہوں گی، سامنے میز پر چائے کی ٹرے بجی ہوگی۔گرین لیبل چائے کی خوشبو اس کے نتھنوں میں بھر گئی...

''باجی یہ لیجئے چائے''۔ چھوٹی بہن نشو چائے کی پیالی لئے کھڑی تھی اونٹی ہوئی چائے کے اوپر پتلی بالائی کی جھلی سی جم گئی تھی... عفت کا جی متلا گیا۔بہر حال چائے تو حلق سے اتارنا ہی تھی۔

سلیمہ، نشو، پپو اور چنو سب اس کے پاس آکر جمع ہوگئے تھے۔عفت نے چچی جان کے بھیجے ہوئے چھوٹے موٹے تحفے نکال کر دیئے۔پپو اور چنو کے لئے بستے اور سلیمہ اور نشو کے لئے

شلوار سوٹ کا کپڑا اور پھر کئی پرانی مگر اچھی حالت کی ساڑیاں اور سوئٹر جن کا فیشن اب ختم ہو گیا تھا وہ بھی بھجوائی تھیں چچی جان نے۔

رات کو عفت سلیمہ اور نشو ایک کمرے میں سوئیں دوسرے کمرے میں بڑے بھیا چنو اور پپو۔ ابا ہمیشہ کی طرح اپنے کمرے میں، اور رہیں اماں... وہ تو جاڑا، گرمی، برسات سدا برآمدے میں ہی سوتی تھیں۔ عفت کو اپنا دلی والا چھوٹا سا کمرہ بے حد یاد آ رہا تھا۔ صاف ستھرا نواڑ کا پلنگ، چھوٹی سی ڈریسنگ ٹیبل، پڑھنے کی میز، پردے، اٹیچ باتھ روم بس نہیں تھا اسکے کمرے میں جیسا چچی جان کے کمرے میں تھا۔

اف... کیوں آخر آج یہ سب اتنا بیزار کُن لگ رہا ہے... برآمدے میں بچھی کُھرّی چارپائیاں، تین کمروں کا چھوٹا سا گھر. آخر سولہ سال کی عمر تک تو میں یہیں رہی تھی پھر چچی جان نے اپنے پاس دلی بلوالیا تھا۔

چچی جان ابا کے ماموں زاد بھائی کی بیوی تھیں۔ شوکت چچا اور صدیقہ چچی کا ایک ہی بیٹا تھا احمر جو کئی سال ہوئے اپنے بیوی بچوں سمیت امریکہ جا بسا تھا۔ شوکت چچا دلی میں بہت بڑے سرکاری عہدے پر تھے، سرکاری بنگلہ ملا ہوا تھا۔ صدیقہ چچی نے اپنے اکیلے پن کی وجہ سے عفت کو اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ دلی کالج میں بی۔اے میں داخلہ کرا دیا تھا۔ تین سال ہو گئے ان کے پاس رہتے ہوئے۔ چچی جان کا سایہ بن گئی تھی وہ۔ اس گھر میں عفت کے فرائض کی اک لمبی لسٹ تھی۔ ہر جگہ چچی جان کے ساتھ جانا، ان کے کپڑوں کی دیکھ بھال کرنا، فون اٹینڈ کرنا، مہمانوں کی خاطر مدارت، ڈرائنگ روم، اسٹڈی روم اور چچی جان کے بیڈ روم کی جھاڑ پونچھ۔ پڑھائی کے ساتھ ساتھ اس کے ذمّے ہزاروں کام تھے۔ ہر گرمیوں کی چھٹی میں وہ کم سے کم ایک ماہ کے لئے ابا اور اماں کے پاس جا کر رہتی تھی۔ باقی ایک مہینہ گرمی کی چھٹیوں کا صدیقہ چچی کے ساتھ پہاڑوں پر گذرتا تھا۔ مسوری، شملہ، نینی تال، کہاں کہاں وہ چچی جان کے ساتھ نہیں گھومی۔ عفت کے بغیر تو صدیقہ چچی کے جیسے ہاتھ پاؤں کٹ جاتے تھے۔ کون انکی پیکنگ کرائے گا، سامان کھلوائے گا، اگر عفت نہ ہو تو کون یہ سب کام کریگا۔

چھٹیوں میں جب عفت گھر آتی تو ابا کے کمرے کو ڈرائنگ روم کی شکل دینے کی ہر ممکن کوشش کرتی۔ چار پرانی آرام کرسیاں تھیں ان پر رنگین کشن سجاتی، ابا کی بوسیدہ کتابوں کی الماری

پر پردہ ڈال دیا جاتا تھا، مگر کونے میں رکھی میز پر دوائی کی لاتعداد شیشیاں، پرانے رجسٹر اور الم غلم سامان جو آبا کی قیمتی پونجی تھی، سارا کام بگاڑ دیتی تھی۔

اس بار تو عفت کو گھر اور بھی خستہ حال لگ رہا تھا حالانکہ اب تو بھیا بھی ملازم ہو گئے ہیں... ان کی تنخواہ بھی آنے لگی ہے لیکن گھر کا نقشہ وہ ہی ہے... عفت کا جی چاہ رہا تھا کہ خوب روئے... مگر کیوں؟ وہ تو سب خواب ہے... مسوری، نینی تال، پنڈارا روڈ کا بنگلہ، کلچرڈ ماحول، اور پھر چچی جان کے بیٹے اور بہو کی وہ چمکتی ہوئی تصویریں جو امریکہ سے آتی تھیں۔ اونچے درختوں سے گھرا ہوا خوبصورت کاٹج نما مکان، میاں بیوی اور دو بچے تصویر میں ہوتے ہیں سب کے چہرے یوں چمکتے ہوئے لگتے ہیں جیسے ان تصویروں کا چمکیلا چکنا کاغذ۔

''مگر عفت تم نے کیوں خود کو ان تصویروں میں فٹ کر لیا تھا.......... زندگی رومینٹک افسانہ نہیں ہے جو خواتین ڈائجسٹ میں چھپتا ہے.......... کیوں بلاوجہ خواب بننے لگتی ہو... صرف یہ ہی تھا نا؟... چچی جان کا بھانجا انور امریکہ سے آیا تھا.. تمہارے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانوں کی تعریف میں کہہ دیا ''خالہ جان... عفت کی جس سے شادی ہوگی وہ تو بہت خوش قسمت آدمی ہوگا'' ...تو عفت بی آپ چڑھ گئیں کھمبے پر... اور دوڑ دوڑ کر اپنے سگھڑاپے کا مظاہرہ کرنے لگیں۔''

ایک دن انور نے کہہ دیا۔

''عفت کی جیسی فگر کیلئے تو امریکہ میں لڑکیاں ڈائٹنگ کر کے مری جاتی ہیں''۔

تو عفت جہاں تم نے کیوں سمجھ لیا کہ وہ تم پر عاشق ہی ہو گیا ہے... نہ جانے یہ جملہ کہتے وقت انور کے دماغ میں اپنی کون سی امریکن گرل فرینڈ ہوگی جو ڈبلا ہونے کے لئے ڈائٹنگ کر رہی ہوگی... شکر ہے کہ انور کی شادی میں تمہیں چچی جان کے ساتھ لکھنؤ نہیں جانا پڑا تھا، امتحانوں کی وجہ سے صاف بچ گئیں تھیں... اور پھر جب انور اپنی نئی نویلی، خوبصورت، انگریزی بولتی ہوئی ڈاکٹر دلہن کے ساتھ دلی آیا تو تب سمجھ میں آیا تھا کہ عفت بی!... انور کی دلہن ثانیہ ریٹائیرڈ IAS آفیسر کی بیٹی ہے، کونونٹ اسکول کی پڑھی ہوئی ہے اور اٹک اٹک کر اردو بولتی ہے... اور پھر تم چچی جان کے بھانجے اور بھانج بہو کی خاطر میں مسکراہٹیں چہرے پر چپکائے بچھی بچھی جا رہی تھیں...

انور کی دلہن ثانیہ نے کہا تھا۔

''عفت'! آپ تو اتنا اچھا کھانا پکاتی ہیں۔ ہمیں تو کچھ نہیں آتا... ہماری ممی نے سکھایا ہی نہیں۔ انور آپ کے کھانے کی بڑے فین ہیں''۔

ہاں عفت بیگم... تم کیوں بھول جاتی ہو کہ تم اشفاق حسین صاحب کی بیٹی ہو جو سہارنپور میں پرائمری اسکول کے ٹیچر ہیں اور ساتھ ساتھ تھوڑی بہت حکمت بھی کر لیتے ہیں... کیوں دیکھتی ہو بار بار رنگین چمکیلی تصویریں۔

دوسرے دن عفت کی آنکھ حسبِ معمول سویرے ہی کھل گئی... روز صبح چھ بجے چچی جان کو بیڈ ٹی دینی ہوتی ہے، شوکت چچا کے نہانے کے لئے گیزر آن کرنا ہوتا ہے... وہ آنکھیں ملتی ہوئی کمرے سے باہر آئی تو دیکھا اماں باورچی خانے میں بیٹھی چائے بنا رہی تھیں، ابا قریب ہی بچھی چارپائی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ان کی پشت عفت کی طرف تھی، وہ کہہ رہے تھے۔

''ارے بھئی صدیقہ بھابھی کو خدا خوش رکھے، انھوں نے یہ مسئلہ بھی حل کر دیا''۔

اماں ہمیشہ کی کم گو تھیں ''ہوں'' کر کے رہ گئیں۔

عفت الجھ سی گئی یہ کون سی کھچڑی پک رہی ہے اور کون سا مسئلہ ہے جو چچی جان نے حل کر دیا ہے۔ ناشتے کے بعد وہ حسب معمول گھر کی صفائی میں جٹ گئی، ابا کے کمرے کی باری پہلے آئی۔ ان کی میز سے کتابیں سرکائیں تو ایک خط گر پڑا۔ صدیقہ چچی کی لکھائی تھی اس نے خط کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔

بھائی صاحب

آداب!

امید ہے آپ اور بہن خیریت سے ہوں گے، عفت بیٹی تو آپ کی ہے لیکن کچھ حق میرا بھی بنتا ہے حق کیوں فرض کہنا چاہئے۔

بات یہ ہے بھائی صاحب کہ عفت کے لئے میں نے یہاں دلّی میں ایک لڑکا دیکھا ہے۔ کارپوریشن کے اسکول میں ٹیچر ہے۔ خاندان بھی کوئی لمبا چوڑا نہیں ہے باپ کا انتقال ہو چکا ہے، بڑی بہن اپنے گھر کی ہیں، ایک چھوٹا بھائی کالج میں ہے اور ایک چھوٹی بہن ہے جو ماں کے ساتھ رہتی ہے۔ یہیں ذاکر نگر میں رہتے ہیں، سیدھے سادھے لوگ ہیں مگر شریف۔ لڑکے کا نام

بھی شریف ہے۔ جہیز کی بھی کوئی مانگ نہیں ہے۔ اگر آپ کی رائے ہو تو شادی یہیں دلی میں ہو جائے گی۔

بچوں کو دعائیں

آپ کی بھابھی صدیقہ

عفت نے آنکھیں بند کر کے کرسی سے ٹیک لگالی... ہاں! ہاں! نام کے بھی شریف ہیں... دیکھا ہے میں نے... اکثر آتے تھے چچا جان کے پاس کسی سفارش کے سلسلے میں... عفت نے ٹھنڈی سانس بھری... ذاکر نگر اور پنڈارا روڈ میں بہت فاصلہ ہے... تم کر بھی کیا لوگی عفت بی ....ابا کی گرتی ہوئی صحت، چھوٹے چھوٹے بہن بھائی، چچی جان کے احسانات... جہیز کی کوئی مانگ نہیں... کیا امر مانع ہو سکتا ہے اس شادی میں... بس عفت بی زمین پر رہو۔

شریف نے شادی کی تصویریں جلدی سے دھلوا کر فریم کروا کر بہت ذوق وشوق سے کمرے میں سجادی تھیں۔ بڑے بڑے لوگ آئے تھے شادی میں منسٹر، وائس چانسلر، سیاسی شخصیات ...بڑا رعب پڑا تھا شریف کے گھر والوں پر۔ چچی جان نے جہیز بھی ٹھیک ٹھاک دے دیا تھا۔

شادی کے ہنگامے نمٹا کر ابا، اماں اور سب لوگ جب سہارن پور جانے لگے تو چچی جان آزردہ ہو گئیں، بولیں۔

''بھابھی جان! عفت کی شادی کے بعد سے تو گھر کاٹ کھانے کو دوڑے گا، اور میں تو بالکل ہی بے دست و پا ہو جاؤں گی، سلیمہ نے ماشاء اللہ ہائی اسکول کر لیا ہے اسے میرے پاس چھوڑ دیجیے۔''

عفت کی آواز سے سب چونک پڑے۔

''نہیں! بالکل نہیں! سلیمہ کو ابا اور اماں کے پاس ہی رہنے دیجیے۔''

عفت کو خود اپنے لہجے کی کاٹ پر حیرت ہو رہی تھی۔

☆☆

ڈیڈ انڈ

Dead End

میں راستہ بھی تو نہیں بدل سکتی، آفس آتے جاتے روز اسی بلڈنگ کے سامنے سے گذرنا ہوتا ہے... سال بھر سے زیادہ ہوگیا، لیکن جب بھی یہاں سے گذرتی ہوں تو کھڑکی سے وہ چہرے جھانکتے نظر آتے ہیں، اور خاص طور پر وہ چاند سا چہرہ... ہمیشہ سوچتی ہوں کی اس کھڑکی اور بالکنی کی طرف دیکھوں بھی نہیں پھر بھی غیر ارادی طور پر نگاہ اس طرف اُٹھ جاتی ہے... لگتا ہے اب اس اپارٹمنٹ میں کوئی نیا کرایہ دار آ گیا ہے۔ بالکنی میں پھولوں کے گملے سج گئے ہیں... وہ لوگ بھی اسی بالکنی میں بیٹھے ہوں گے کبھی... میں سر جھٹک کر سب کچھ دماغ سے نکال دینا چاہتی ہوں لیکن وہ ہی سوالات دماغ میں گھومتے رہتے ہیں... وہ سائے میرا پیچھا کرتے رہتے ہیں... کیوں ...آخر ایسا کیوں... ہزار توجیہات آتی ہیں دماغ میں...

وہ شام مجھے اچھی طرح یاد ہے، دوراز ے کی گھنٹی بجی تھی۔ سامنے رضوان چودھری اپنے ساتھ اک چھوٹی سی گڑیا جیسی Oriental لڑکی لئے کھڑا تھا۔ سانولا، لمبا تڑنگا، خاصہ ہینڈسم رضوان چودھری بہت دن بعد ہمارے گھر آیا تھا۔ وہ گھنی مونچھوں میں مسکرایا اور انگریزی میں کہا۔

''آپ کے لئے ایک سرپرائز ہے بھابھی اور عشرت بھائی''۔

عشرت نے ہنستے ہوئے اردو میں کہا۔

''خواتین دوستوں میں اک نیا اضافہ یہ کون سے سرپرائز کی بات ہے''

''او! نہیں جی'' وہ اپنے پنجابی لہجے میں بولا۔

''دفع کریں جی ان لقندریوں کو'' اس نے اپنے برابر کھڑی گڑیا نما لڑکی کا ہاتھ تھام لیا

اور ڈرامائی انداز سے جھک کر بولا۔

''ایک عدد بیگم۔سلوی عرف فرحانہ''۔

کناڈا میں دورانِ تعلیم ہمارے لئے ایسی مخلوط النسل شادیاں دیکھنا کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی لیکن ایسی شادیوں میں ہندوستانی پاکستانی لڑکوں کے ساتھ عموماً کوئی ''گوری'' ہوتی تھی۔ رضوان کی بیگم یقینی طور سے مشرق بعید سے آئی ہوتی لگتی تھی۔

صوفے پر وہ دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیکر بیٹھ گئے۔سلوی ذرا کونشس سی تھی۔رضوان مجھ سے بولا۔

''پچھلے ہفتے ہمارا نکاح ہوا ہے مسجد میں۔ بھابی! آپ سے ملانے لایا ہوں ذرا اسے اپنا کلچر شلچر سکھادیں''۔

میں ہنس دی۔

''گھول پر پلاؤں یا کلچر کا تعویز دے دوں''۔

سلوی نے لفظ کلچر سے شاید اردو میں کی گئی ہماری گفتگو کچھ کچھ سمجھ لی تھی، بولی۔

''ہنی! تمہارا کلچر سمجھنے میں مجھے مشکل نہیں ہوگی۔آخر کار ہم مشرقی ہیں نا۔تم سے یوں ہی بے سوچے سمجھے تو میں نے شادی نہیں کی''۔

سلوی کی انگریزی بہت صاف اور شستہ تھی۔

واہ بھئی واہ... میں نے سوچا...رضوان چودھری صاحب آپ پنجاب کے گاؤں کے زمیندار کہاں اٹک گئے مس ''چن چو'' سے۔میں نے اس گڑیا جیسی لڑکی سے ادھر اُدھر کی گفتگو کی تو اندازہ ہوا کہ سلوی کافی ذہین اور الرٹ ہے۔وہ مجھے کافی پرتجسس اور تھوڑی بے چین سی لڑکی لگی تھی۔ رضوان چودھری سے بھی میری صرف دوتین بار پہلے ملاقات ہوئی تھی وہ بھی ہماری یونیورسٹی میں ہی انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کررہا تھا۔ایک دوبار پڑھائی کے سلسلے میں کچھ پوچھنے عشرت کے پاس آیا تھا۔وہ بن بن کر امریکن لہجے میں انگریزی بولتا تھا لیکن جب پنجابی آمیزا ردو میں بے تکلف گفتگو کرتا تھا تو اس کا بہت اکھڑ انداز ہوتا تھا۔شوکت نے بتایا تھا کہ وہ لاہور کے کسی گاؤں کے چھوٹے موٹے زمیندار کا بیٹا ہے۔

سلوی سے گفتگو کرنے کے لئے مجھے کوئی خاص محنت نہیں کرنی پڑی وہ خود ہی بولے

جا رہی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ یونیورسٹی میں پارٹ ٹائم بی۔ کام کے کورسیز کر رہی ہے اور رات کو بوڑھے لوگوں کے ایک نرسنگ ہوم میں کام کرتی ہے۔ سلوی کو میرے حوالے کر کے رضوان عشرت سے باتیں کرنے لگا۔ سلوی کو مجھ سے باتیں کرتے دیکھ کر بولا۔

''بھابھی! یہ بک بک بہت کرتی ہے، دماغ کھا جاتی ہے سوال پوچھ پوچھ کر سالی''۔

رضوان کے اکھڑ پن کو جانتے ہوئے بھی نئی نویلی دلہن کے لئے اس کا یہ اندازِ گفتگو مجھے بہت عجیب سا لگا۔

سلوی مجھ سے میری تعلیم اور فیملی وغیرہ کے بارے میں سوالات کرتی رہی، بہت توجہ اور دلچسپی سے میرا فیملی البم دیکھا۔ میں نے یوں ہی پوچھ لیا۔

''تمہاری ساری فیملی کہاں ہے سلوی''۔

''کہیں بھی نہیں''۔ اس نے کہا، ایک سایہ سا اس کے چہرے پر لہرا گیا تھا، پھر وہ سنبھل کر بولی۔

''میں ویٹ نام کی جنگ ختم ہونے کے بعد ۱۹۷۶ء میں ریفیوجی بن کر کناڈا آئی تھی۔ چند دور کے رشتے دار ہیں امریکہ میں اور بس''۔

میں نے مزید اس سلسلے میں سوالات کرنا مناسب نہیں سمجھا، سلوی مجھے دیر تک اپنے مستقبل کے پلان بتاتی رہی۔

''جب رضوان اپنی انجینئرنگ ختم کر لے گا میں رات کی نوکری چھوڑ دوں گی۔ اپنی B.Com کی ڈگری ختم کروں گی اور کوئی اچھی سی جاب لے لوں گی، پھر ہم لوگ سیٹل ہو جائیں گے۔ گھر خریدنے کے لئے ڈاؤن پے منٹ کی رقم تو میں ابھی سے جمع کر رہی ہوں، اصل میں مجھے بچے بہت پسند ہیں۔ پھر بچوں کے لئے بڑا گھر بھی چاہیے۔ ایک بچہ ابھی ہو جائے تو کوئی حرج نہیں، مجھے بڑی فیملی اچھی لگتی ہے، میرے خود کئی بہن بھائی...''

وہ کہتے کہتے رک گئی تھی۔

واپس جاتے وقت رضوان بولا۔

''بھابھی سمجھا دیا نا آپ نے! کہہ دیں اسے کہ ہمارے یہاں عورتیں مرد کی تابع دار ہوتی ہیں مجازی خدا سمجھتی ہیں خاوند کو''۔

میں نے ہنس کر کہا۔

''مجھ سے امید نہ رکھنا۔ میں تو اس کے ہاتھ میں Feminism کا جھنڈا دے دونگی''۔

سلوی نے ہماری اردو میں ہونے والی گفتگو پر سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔

رضوان نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر کہا۔

''Honey! میں بھابھی سے کہہ رہا تھا کہ تمہیں پاکستانی کھانے پکانا سکھا دیں''۔

جاتے جاتے سلوی نے کہا۔

''آپ سے مل کر مجھے ایسا لگا کہ جیسے ہماری ملاقات برسوں پرانی ہے''۔

مجھے بھی وہ چھوٹی سی گڑیا جیسی لڑکی اچھی لگی، اسے دیکھ کر ایک صاف ستھرے پن کا احساس ہوتا تھا، زندگی سے بھرپور نظر آتی تھی وہ۔

اس ملاقات کے بعد مہینے گذر گئے ہم لوگ بھی اپنی پڑھائی میں مشغول ہو گئے۔ کبھی کبھار یونیورسٹی میں آتے جاتے ہیلو، ہائے ہو جاتی تھی۔ کرسمس کی چھٹیوں میں سلوی نے فون کر کے ہم دونوں کی کھانے پر مدعو کیا۔ اسکا گھر بہت صاف ستھرا اور سلیقے سے سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر خوبصورت واٹر کلر تصویروں کے درمیان دو فریم کیئے ہوئے فوٹو گراف بھی تھے ایک گروپ فوٹو گراف یقیناً سلوی کی فیملی کا تھا دوسرا فریم شدہ فوٹو رضوان کے والدین کا لگتا تھا اس فوٹو میں ایک صاحب سر پر پگڑی باندھے، مونچھوں پر تاؤ دیئے کرسی پر اکڑے بیٹھے تھے ساتھ ہی ایک خاتون بیل لگا دوپٹہ سر سے اوڑھے کیمرے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

سلوی نے بہت مزے کا ویٹ نامی کھانا پکایا تھا، ہم لوگوں کے کھانے کی طرح چٹپٹا تھا، اس نے مرغی کا سالن ہمارے انداز کا پکایا تھا وہ بھی کافی مزے دار تھا۔ خود گھر میں نان بھی بنائے تھے، میز بھی بہت خوبصورتی سے سجائی تھی۔ کھانے کے دوران اور میز صاف کرتے وقت سلوی جب بھی کسی کام کے لئے رضوان سے کہتی تو وہ بڑبڑاتا ہوا اٹھتا تھا۔

''ہنی Honey! کر کے ہر وقت کام کرواتی رہتی ہے''۔

میں نے کہا۔

''رضوان تمہاری تو لاٹری نکل آئی، بہت سلیقہ مند لڑکی ہے کھانا بھی بہت اچھا پکاتی ہے''۔

رضوان حسب عادت اردو میں بولا۔

''بڑی مصیبت ہے جی، بھابھی! سیٹر ڈے کو سارا دن بازاروں میں گھومنا پڑتا ہے۔ پاکستانی گروسری اسٹور جاؤ، اپنے کھانا پینے کا سامان خریدنے پھر چائنا ٹاؤن کے چکر لگاؤ اس کی الا بلا خریدنے کے لئے۔ اور پھر گھر کی صفائی کا پاگل پن ہے اسے، چین سے بیٹھنے ہی نہیں دیتی، ہنی! یہ کرو، وہ مت کرو، اپنے موزے اٹھا کر رکھو، کوڑا پھینک کر آؤ...سالے ہنی کو پاگل بنا دیا''۔

مجھے ہنسی آ گئی، میں نے آہستہ سے کہا۔

''بھلے آدمی! تم مستقل اردو اور پنجابی بول رہے ہو وہ کیا سوچے گی'' رضوان نے کندھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

''سوچتی ہے تو سوچتی رہے میں نے کیا ٹھیکہ لیا ہے''۔

اس دعوت کے بعد پھر ہماری ملاقات ہوئے مدت گذر گئی۔ فون پر بھی بات نہیں ہو سکی حالانکہ کئی بار خیال آیا کہ سلوی سے بات کروں مگر موقع ہی نہیں ملا، اک دن رضوان عشرت کے پاس کسی کام سے آیا، وہ ان کا ایک کورس ٹیوٹر کر رہا تھا۔ میں نے رضوان سے سلوی کی خیریت پوچھی تو بولا۔

''آج کل اسے بچہ بنانے کی دُھن لگی ہوئی ہے۔ میں یہ وبال نہیں پالنا چاہتا، ایک تو بھابھی وہ شکی بہت ہے، کہاں گئے تھے؟ کس کا فون تھا؟ رات کو اپنی ڈیوٹی کے وقت میں بھی نرسنگ ہوم سے فون کرتی ہے یہ چیک کرنے کے لئے کہ میں گھر پر ہوں کہ نہیں۔ یہ چاہتی ہے پاگل دی پُتری کہ میں گھر میں بیٹھ کر انڈے دیا کروں''۔

ایک دن میں پڑھتے پڑھتے اکتا گئی تو یونہی ٹہلنے کے لئے شاپنگ سینٹر کی طرف نکل گئی وہاں سلوی نظر آئی وہ پہلے سے ذرا موٹی ہو گئی تھی۔ اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ رسمی دعا سلام کے بعد وہ بے تابی سے بولی۔

''تم کو پتہ ہے میں "Pregnant" ہوں، چار مہینے ہو گئے ہیں''۔

ہم لوگ قریب کے ریستراں میں کافی پینے چلے گئے، وہ بہت خوش تھی حسب عادت مستقل بولے جا رہی تھی۔

''ہمارا بچہ ہم دونوں کو قریب لے آئیگا۔ رضوان اِدھر اُدھر بھاگے گا بھی نہیں۔ دیکھو! میں رات کی جاب کرتی ہوں اس لئے دن میں گھر پر رہتی ہوں اور رضوان رات کو گھر پر رہتا ہے تو

وہ رات کو آرام سے بچے کو دیکھ لیا کرے گا... چاہے لڑکا ہو یا لڑکی مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

وہ مجھے دیر تک اپنی شاپنگ دکھاتی رہی۔ وہ بچے کے کپڑے، اون Baby care سے وغیرہ متعلق کتابیں وغیرہ لے کر آئی تھی۔

رضوان اور سلوی سے ملاقات ہوئے پھر ایک عرصہ گذر گیا۔ میرا ڈپلومہ ختم ہو گیا تھا اس لئے تین مہینے کے لئے میں ہندوستان چلی گئی، واپس آئی تو نوکری ڈھونڈنے میں لگ گئی، جلدی ہی ایک اسکول میں عارضی ٹیچر کی جگہ مل گئی۔ عشرت اپنی P.hD کی تھیسس لکھنے میں غرق تھے، وقت تیزی سے بھاگ رہا تھا، ایک روز میں دوپہر کو اسکول سے واپس آئی تو دیکھا کہ عشرت حسب معمول ڈائنگ ٹیبل پر اپنے کاغذات پھیلائے بیٹھے ہیں ایک تین چار سال کی بچی گلابی فراک پہنے پاس ہی اسٹرولر میں بیٹھی تھی۔

عشرت ہنس کر بولے۔

"پتہ نہیں کون اس بچی کو کاریڈور میں چھوڑ گیا تھا میں اٹھالایا"۔

بہت ہی پیاری چاندی بچی تھی بالکل گول چہرہ، موتی کا سا رنگ گھنگھریالے بال۔

اتنی دیر میں کچن سے رضوان ہاتھ میں بچی کے دودھ کی بوتل لئے ہوئے نکلا۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اچھا تو یہ آپ کا شاہکار ہے، کتنی پیاری ہے، ویسے تمہاری لگتی نہیں ہے۔ اتنی خوبصورت ہے"۔

عشرت بولے۔ "بچہ پالتے ہوئے اچھا لگتا ہے نا رضوان"

میں نے پوچھا۔ "کیا نام رکھا ہے"

رضوان بچی کا منہ ٹشو سے صاف کرتا ہوا بولا۔

آمنہ... میری دادی کا نام تھا۔ دیکھا بھابھی پھنس گیا نا میں، ساری شام اس کی بے بی سٹنگ کرنی پڑی ہے۔ آج سلوی کو کہیں کام سے جانا تھا تو دن میں بھی ڈیوٹی لگ گئی۔ مجھے یونیورسٹی کی لائبریری سے اک ضروری کتاب لینی تھی اس لیئے آپ کے پاس تھوڑی دیر چھوڑ کر جاؤں گا آمنہ کو"۔

اس نے احتیاط سے بچی کے گلے میں بب باندھا، منہ میں دودھ کی بوتل لگائی اور بولا۔

''اب بس یہ سو جائے گی۔'' وہ ہنسا۔

''بھابی! اگر میں بچی کو اسٹرولر میں ڈال کر یونیورسٹی لے گیا تو اپنا چانس بالکل ہی چلا جائے گا لڑکیوں کے ساتھ''۔

عشرت بولے ''سدھر جاؤ رضوان چودھری! تمہاری بیوی تو ویسے ہی بڑی شکی ہے۔''

رضوان مسکرایا۔ ''بس جی ذرا دل پشوری کرتا ہوں''۔

وہ دروازے کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔

''بڑی شکی عورت ہے۔ سالی بہت جھگڑنے لگتی ہے۔ آمنہ کے بعد سے اور شیر ہو گئی ہے۔ جب وہ گھر پر ہوتی ہے نا...... تو میں پڑھائی کا بہانہ بنا کر گھر سے غائب ہو جاتا ہوں''۔

''اور چھوکریوں کے ساتھ گھومتا ہوں''۔ عشرت نے کہا۔

رضوان کے جانے کے بعد وہ بولے۔

''اس بدتمیز لڑکے نے یونیورسٹی میں کسی کو ہوا نہیں لگنے دی کہ یہ شادی شدہ ہے''۔

ایک دن سلویٰ کا فون آیا۔ وہ بغیر کسی تمہید کے بولی۔

''میں تمہیں ٹرسٹ کرتی ہوں۔ بتاؤ کیا رضوان دوسری لڑکیوں کے چکر میں ہے؟''۔

میں گڑبڑا گئی۔ اکثر میں نے رضوان کو کیفٹریا میں، سڑک پر، لائبریری، میں کئی لڑکیوں کے ساتھ دیکھا تھا، انداز بھی کافی عاشقانہ تھے۔ لیکن میں سلویٰ سے کیا کہتی۔

''دیکھو پڑھائی کے دوران اکثر لڑکیوں کا ساتھ رہتا ہے اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ کسی سے افیئر چل رہا ہو۔'' میں نے صرف اتنا ہی کہا کہ سلویٰ نے میری بات کاٹ دی، اس کی آواز میں ہلکا سا غصہ تھا۔

''بات صرف افیئر کی ہی تو نہیں ہوتی۔ جب میرے ساتھ وقت گذارنے کی بات ہوتی ہے تو وہ پڑھائی میں گلے گلے ڈوبا ہوتا ہے اور دوسری لڑکیوں کے ساتھ وقت گذاری کے لئے اسے فرصت ہے''۔

اس نے ایک دم فون رکھ دیا مجھے حیرت ہوئی کیونکہ عموماً وہ بہت اخلاق سے پیش آتی تھی۔

کوئی دو مہینے بعد وہ ایک دن اچانک ہمارے گھر آئی، بچی بھی ساتھ تھی۔ آمنہ اب پاؤں پاؤں چلنے لگی تھی وہ پھول کی طرح نازک سی بچی تھی... کالی چمک دار آنکھیں، چاند سا چہرہ۔

اس دن سلوی بہت تھکی تھکی سی لگ رہی تھی چہرے پر وحشت سی تھی تھوڑی دیر ادھر ادھر کی باتیں کرنے کے بعد وہ بولی۔

''میں تمہارے پاس آئی ہوں... حالانکہ تم کیا کرسکتی ہو... استعمال کیا گیا ہے مجھے... مل گیا نا!... مل گیا رضوان کو امگریشن... بچے کی ضد میری ہی تھی، وہ تو دامن بچاتا تھا... میں مسلمان ہوئی، بچی کو مسلمان بنایا... وہ... وہ بالکل Hypocrate ہے بیئر کی بوتلیں چڑھا کر مسلمان بنتا ہے''۔

میں اس سے پہلے جب بھی اس سے ملی تھی تو اسے بہت اعتماد کے ساتھ بات کرتے ہوئے دیکھا تھا، آج وہ عجیب طرح بول رہی تھی۔

سلوی ایک دم رونے لگی، اس کی بچی گھبرا کر ماں کا منہ تکنے لگی۔ سلوی نے دیوانوں کے طرح بچی کا منہ چومنا شروع کر دیا۔ پھر رک کر غصے میں بولی۔

''وہ کہتا ہے طلاق لے لو... چھوڑ دو مجھے میں بُرا ہوں... بہت آسان بات ہے نا... میں لوٹ کر کہاں جاؤں... زندگی دوبارہ کہاں سے شروع کروں تنکہ تنکہ کر کے میں پھر سے گھونسلہ بنا رہی تھی... پھر کوئی بم کیوں نہیں گر جاتا... ایک بار پھر... ''۔

وہ ہذیانی سی کیفیت میں تھی ادھورے ادھورے بے ربط سے جملے بول رہی تھی۔ میں نے اسے ٹھنڈا پانی پلایا، سمجھانے کے لئے تو کچھ تھا ہی نہیں میرے پاس جو اس سے کچھ کہتی۔

ہمارا اپارٹمنٹ دسویں منزل پر تھا، نیچے سڑک پر سے اچانک گاڑیوں کے بریک لگنے کی آواز آئی، ہارن بجنے لگے۔ میں نے جھانک کر دیکھا دو تین گاڑیوں کا بھیانک ایکسیڈنٹ تھا۔ منٹوں میں پولیس اور ایمبولنس آ گئی۔ ایک کار میں سے خون سے لت پت ایک لڑکے کو نکال کر ایمبولنس میں ڈالا جا رہا تھا۔ دوسری گاڑی بالکل بھرتا بن گئی تھی۔ میں تو کانپ گئی لیکن سلوی نے ایک منٹ کے لئے آ کر جھانکا اور پھر واپس آ کر صوفے پر بیٹھ گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، اور وہ دوبارہ وہی اپنی بکھری، الجھی باتیں کرنے لگی، مجھے یہ کچھ عجیب سا لگا۔ بچی اس سے بار بار کچھ کہہ رہی تھی، توجہ چاہ رہی تھی، تو وہ غصے سے اس پر چلا پڑی، پھر خود بھی رونے لگی اور بچی کو سینے سے لگا لیا۔

میری سلوی سے اس ملاقات کو کئی مہینے گذر گئے، کئی بار دل بھی چاہا کہ اس سے فون پر بات کروں لیکن پھر سوچا کہ میں اس کے مسائل کا کوئی حل تو نکال نہیں سکتی تو پھر اس سے کیا بات کروں۔ ایک دن سیٹر ڈے کو ہم لوگ سکون سے بیٹھے کیسٹ پر غزلیں سن رہے تھے، وہ اکتوبر کا

اک پرسکون، روشن دن تھا۔ صبح کے نو بجے تھے کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ عشرت نے اٹھایا۔

''ہلو... جی میں عشرت علی بول رہا ہوں''۔

وہ کسی سے انگریزی میں کہہ رہے تھے۔ میں اٹھ کر چائے بنانے چلی گئی۔

کچن میں ان کی آواز آ رہی تھی۔

''یس... رضوان چودھری... ہاں میں جانتا ہوں... کیوں کیا بات ہے۔''

پھر اچانک عشرت کی چیخ سنائی دی۔

''what... کیا... کیا ہوا؟''

میں دوڑ کر کچن سے باہر آئی۔ عشرت فون کا کریڈل کان سے لگائے غور سے کسی کی بات سُن رہے تھے، چہرہ وحشت ناک ہو رہا تھا، چند منٹ ٹیلی فون پر بات سننے کے بعد انھوں نے بیٹھی بیٹھی آواز میں کہا۔

''OK... آدھے گھنٹے بعد آ جایئے''۔

وہ چند منٹ تک فون ہاتھ میں لئے بیٹھے رہے۔ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتے رہے، پھر کہا۔

''ختم کر دیا... مار ڈالا... دونوں کو''۔

میں چیخ پڑی۔

''کیا... کیا کہہ رہے ہو... کسے''

''رضوان اور بچی کو بھی... اس نے...''۔

شوکت کی زبان سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔

''پولیس کا فون تھا۔ انھیں میرا فون نمبر رضوان کی ڈائری میں ملا ہے... کل رات... اس نے خود بھی خودکشی کی کوشش کی تھی۔ اپنی کلائی کاٹی تھی... وہ اسپتال میں ہے... لاشوں کی شناخت کے لئے جانا ہے مجھے''۔

آدھے گھنٹے بعد ایک پولیس آفیسر نے ہمارے دروازے کی گھنٹی بجائی۔ اس نے بتایا کہ کل رات گیارہ بجے سلوی نے رضوان کو سوتے میں چاقو مار کر قتل کر دیا۔ بچی کو نیند کی گولیاں دے دیں۔ اس نے خود اپنی کلائی کی رگ کاٹی، پھر پولیس کو خود ہی فون کیا... وہ ابھی زندہ ہے۔

پولیس نے بتایا کہ انھوں نے رضوان کی ٹیلی فون ڈائری سے کئی نمبر ٹرائی کیے مگر کوئی بھی جاننے والا لاشوں کی شناخت کے لئے تیار نہیں ہے۔ پولیس آفیسر کے ساتھ عشرت چلے گئے۔ ڈیڑھ گھنٹے بعد جب وہ مردہ گھر سے واپس آئے تو ان کا چہرہ سفید تھا۔ تھوڑی دیر ساکت صوفے پر بیٹھے رہے آہستہ آہستہ کہنے لگے۔

''پولیس آفیسر کہہ رہا تھا... کل رات جب وہ ان کی اپارٹمنٹ میں داخل ہوئے تو... فرش پر دو پاکستانی پاسپورٹ پھٹے ملے تھے ایک پر رضوان کا نام تھا دوسرا آمنہ کا تھا۔ قریب ہی دو P.I.A. کی ٹکٹ تھے۔ پرسوں یعنی پیر کے دن باپ بیٹی کی فلائٹ تھی.. چھپ کر بچی کو پاکستان لے جانے کا پروگرام بنایا تھا رضوان نے ... ہاں اور وہ بھی آج صبح ہاسپٹل کھڑکی سے کود گئی... ختم ہوگئی سلوی بھی''۔

چار سو ساٹھ ایلمر اسٹریٹ

آج ہوا بھی کتنی تیز ہے ہڈیوں میں گھسی جا رہی ہے، برف کا طوفان شام چھ بجے سے ہی شروع ہو گیا تھا۔ شاید موسم کو بھی پتہ ہے کہ یہ میری آخری رات ہے۔ کل صبح کیا ہوگا... کاش کل صبح ہی نہ ہو!... کہاں ہیں سب میرے پرانے ساتھی، ساتھ تو میں نے ہی سب کا دیا تھا، سب کے کام آئی مگر مجھے کیا ملا... خیر وہ لوگ بھی بے چارے مجبور تھے، کر بھی کیا سکتے تھے، سب اپنے اپنے حال میں مبتلا، بہر حال انھوں نے مجھے پیار تو دیا تھا نا... کتنی سہانی یادیں ہیں ... ان سب کی آوازیں، قہقہے، دکھ سکھ، آنسو، میرے دل کے تہہ خانوں میں رہتے ہیں... چلو جیسا بھی ہے سب سے مل تو لوں آج کی رات... خدا حافظ کہہ دوں سب کو... خیر ان میں سے کوئی بھی زندگی بھر مجھے بھلا تو نہیں سکتا۔ کل میں تو نہیں رہوں گی اس دنیا میں مگر یہ لوگ تو زندہ رہیں گے... چلو سب سے مل لوں آخری بار، کل صبح تو سب کچھ... وقت بہت کم ہے...

اپارٹمنٹ نمبر 103، اس کا دروازہ تو عموماً کھلا ہی رہتا ہے مسز ملز کا گھر ہے نا یہ! ہمیشہ کاریڈور میں ان کی دو تین بلیاں ٹہلتی رہتی ہیں آج نظر نہیں آ رہی ہیں... ہلو میڈیم... مسز ملز... آج آپ اپنے جھبرے بالوں والے کتے Pavarotti کو ٹہلانے بھی نہیں نکلیں... اچھا! آج آپ کی گٹھیا کا درد زوروں پر ہے، موسم بھی تو اتنا خوفناک ہے، تین دن سے مسلسل برف پڑ رہی ہے... اچھا! آپ کی بیٹی آئی تھی کل... بڑی اچھی لڑکی ہے، ہر ہفتے آتی ہے آپ کے پاس، آپ کے چھوٹے موٹے کام کروا دیتی ہے، آپ کو اپنی گاڑی میں لے جا کر سپر مارکیٹ سے ہفتے بھر کا سودا سلف خریدواتی ہے... مسز ملز! شادی نہیں کی ابھی آپ کی لڑکی نے... ہاں ہاں نوکری تو اس کی بہت اچھی ہے اور ہاں اس نے نئی اسپورٹس کار بھی تو لے لی ہے... ونڈر فل... غم نہ کریں مسز ملز!

آپ کالڑ کا نہیں ملنے آتا نہ سہی کبھی کبھی فون تو کر ہی دیتا ہے نا...اچھا!...وہ تو اپنی گرل فرینڈ کے ساتھ مدت سے رہتا ہے۔آپ کی بات نہیں مانتا؟...اپنی گرل فرینڈ سے شادی نہیں کرتا، آپ کو پوتا پوتی کا بہت ارمان ہے نا...کوئی بات نہیں مسز ملز! مت اداس ہو، دیکھو تمہارا کمرہ کتنی خوبصورتی سے سجا ہے، تمہاری بلیاں کتنی پیاری ہیں۔خدا حافظ مسز ملز...خدا آپ کو خوش رکھے...خدا حافظ۔

افوہ! اپارٹمنٹ نمبر 104 سے مچھلی اور مسالوں کی کتنی تیز خوشبو آ رہی ہے، خوشبو یا بدبو ...لگتا ہے مسٹر اسلام نے آج پھر بنگالی اسٹائل کی مچھلی پکائی ہے تبھی تو مسز ملز نے اپارٹمنٹ کا دروازہ بند کر دیا ہے...چلو مسٹر اسلام سے مل لوں، انھیں تو ویسے بھی باتیں کرنے کا بہت شوق ہے، مجھے اکثر بنگلہ دیش کی سیاست سمجھاتے رہتے تھے...ہلو مسٹر اسلام! کیسے ہو، کیا ہوا تمہارے کیس کا ...اچھا ہو گیا...مبارک ہو! تم ریفیوجی ہو گئے ...ارے سوری! میرا مطلب یہ ہے کہ کناڈا کی گورنمنٹ نے تم کو ریفیوجی کا اسٹیٹس دے دیا، اب سال بھر میں امیگریشن بھی مل جائے گا...اچھا تم کو نوکری مل گئی...کہاں؟...ٹکسٹائل مل میں ملی ہے؟ مگر تم تو انجینئر تھے نا بنگلہ دیش میں...ارے مسٹر اسلام تم تو دکھی ہو گئے ...مت پریشان ہو... This is a land of equal opportunity...گڈ لک مسٹر اسلام... بائی بائی۔

یہ اپارٹمنٹ نمبر 205 میں پھر ہنگامہ مچا ہوا ہے، لگتا ہے باربرا اور لنڈا میں پھر جھگڑا ہوا ہے...بھئی! یہ نئے زمانے کی باتیں میری تو سمجھ میں نہیں آتیں۔یہ lesbian اور Gay کا چکر ...بلڈنگ کا منیجر جمی ہے نا! وہ کہتا ہے یہ دونوں لڑکیاں Lasbian ہیں۔دونوں ایک ساتھ رہتی ہیں اور لڑتی بھی بہت ہیں اور ڈرگس بھی لیتی ہیں... ہاں تبھی تو یہ پورے کاریڈور میں حشیش کی بو پھیلتی رہتی ہے۔اکثر ان کے اپارٹمنٹ کا دروازہ کھلا رہتا ہے، اندر کتنی گندگی رہتی ہے...افوہ! ان دونوں کے اپارٹمنٹ سے نکل نکل کر کاکروچ برابر کے اپارٹمنٹ میں جا رہے ہیں... باپ رے باپ! یہ تو مسٹر اور مسز کستیلو کا گھر ہے وہ دونوں تو بہت صفائی پسند ہیں مگر بے چارے بہت بے زبان ہیں، کبھی شکایت بھی نہیں کرتے بس اپنے کام سے کام رکھتے ہیں دونوں۔کام کرتے ہیں اور بس پیسے جمع کرنے کی دھن میں ہیں کہ واپس اپنے وطن میکسکو جائیں گے یا شاید جا کر کیلی فورنیا میں رہیں گے جہاں موسم گرم رہتا ہے ان کے وطن کی طرح ...خدا حافظ لنڈا اور باربرا... بائی بائی مسٹر مسز کستیلو میری نیک خواہشات تمہارے ساتھ ہیں۔باربرا! تم تو اچھی

خاصی تھیں، نوکری بھی کرتی تھیں اب کیا ہو گیا تمھیں، تم بھی لنڈا کی طرح ویلفیئر لینے لگیں...واہ! واہ! کناڈا کی حکومت بھی کیا مفت خورے پال رہی ہے...ادھر اپارٹمنٹ نمبر 206 کی بڑی بی مسز کنطارڈی کو دیکھو، (۵۵) برس کی ہونے کو آئیں مگر نوکری کیئے جاتی ہیں، میاں بھی بہت محنتی ہیں۔ یہاں آئے تھے اٹلی سے ۳۵ برس پہلے، اب تو ان کے بچے جوان ہو گئے اپنے اپنے گھر بسا لئے مگر میاں بیوی اسی طرح محنت کرتے ہیں اور بیوی کو تو گھر کی صفائی کا جنون ہے...خدا حافظ...مسز کنطارڈی...تم سب مجھے بھلانا مت، بہت پرانا ساتھ تھا تمہارا۔ بس اب تو تمھارے پاس میری یادیں ہی رہ جائیں گی۔

اپارٹمنٹ نمبر 207 ہمیشہ کی طرح سے بند پڑا ہے...وہ تو یونیورسٹی ہی میں زیادہ وقت گزارتا ہے...ارے وہ جو لڑکا رہتا ہے نا انڈین...کیا نام ہے اس کا...بڑا مشکل نام ہے...ہاں! وینکٹارمن، میں تو مسٹر V ہی کہتی ہوں...چلو بیل بجا کر دیکھتی ہوں... ہلو مسٹر وی...کیسی چل رہی ہے تمہاری پڑھائی...ارے! ہو گئی تمہاری پی ایچ ڈی، مبارک ہو...اور سامان کیوں پیک کر رہے ہو، کہاں جا رہے ہو؟...انڈیا واپس جا رہے ہو نا؟...نہیں...اوہ! اچھا...واہ مبارک ہو کہ تم کو امریکہ میں نوکری مل گئی، گرین کارڈ بھی مل گیا؟...کیا کہنے...کیا کہا! شادی کرنے جا رہے ہو انڈیا؟...مگر...مگر تمہاری گرل فرینڈ سوزان کا کیا ہو گا جو پچھلے پانچ سال سے ہر ویک اینڈ تمہارے پاس آ کر رہتی تھی، تمہارے کمرے کی صفائی کرتی تھی...اس نے تو اِڈلی اور ڈوسا بھی بنانا سیکھ لیا تھا...کتنی اچھی لڑکی ہے وہ...اچھا؟ تمہارے ماں باپ نے انڈیا میں شادی طے کر دی ہے، کمال ہے! تم نے لڑکی کو دیکھا بھی نہیں اور ہاں کر دی، ویری فنی...خیر مجھے کیا، میں تو خدا حافظ کہنے آئی تھی، کل تم کہاں میں کہاں۔ مسٹر وی جہاں بھی ہو گے مجھے بھول تو نہیں سکتے تم.......... بائی بائی......... شادی مبارک!

یہ زینے سے کون اتر رہا ہے؟ ارے یہ تو Mary Ann ہے...ہلو! میری این! کیسی ہو تم؟ اتنی موٹی کیوں ہو رہی ہو، آج کل پھر خوب چاکلیٹ اور آلو چپس کھا رہی ہو گی...کیوں...کیا کہا؟ آج کل کوئی جاب نہیں ہے، تم تو لانڈری میں کام کرتی تھیں؟...خیر پھر مل جائے گی نوکری مگر اتنی موٹی مت ہو...اچھا یہ کب ہوا؟..تمہارا وہ بوائے فرینڈ بھاگ گیا تمھیں چھوڑ کر...، چہ، چہ، چہ...بڑا افسوس ہوا، غم نہ کرو، اللہ اور دے گا...اور دیکھو دن بھر T.V. مت دیکھا کرو...اور ہاں! اب جو بوائے فرینڈ بنانا تو فوراً اپنے Apartment میں بلا کر مت رکھ لینا تم بھی دیوانی ہو، جو بھی بوائے فرینڈ ہوتا ہے اس کی اماں بن جاتی ہو، جی جان سے اس کی

خدمت کرنے لگتی ہو...اچھا.. take care...خدا حافظ میری این۔

چلو اچھا ہوا مسز صدیقی سامنے آتی مل گئی، بہت اچھی عورت ہے...ہلو مسز صدیقی ! کیسی ہو... بڑی اچھی لگ رہی ہو آج کل...اچھا تمہیں جاب مل گئی؟ مبارک ہو! تم نے بھی تو اتنی محنت سے کمپیوٹر کا کورس کیا تھا، مبارک ہو...کیا؟...تم نے مجھے بتایا کیوں نہیں، ہوگئی تمہاری طلاق مکمل؟... ہاں ہاں میں تمہیں مبارک باد ہی دوں گی، اچھا کیا تم نے ہمت کرلی...کس کام کا تھا وہ تمہارا نکھٹو میاں، کیا مجھے بھی نہیں پتہ کہ وہ کام دھام بھی نہیں کرتا تھا اور اوپر سے رعب جماتا تھا تم پر... ہاں ہاں ! کیا مجھے معلوم نہیں کہ تم جب فیکٹری میں کام کرتی تھیں اور شام کو آ کر اپنے میاں کے لئے تازہ کھانا اور چپاتیاں پکاتی تھیں برتن تک وہ اپنے نہیں اٹھاتا تھا...... کیا کرتا تھا وہ دن بھر ،مجھ سے پوچھو...وہ جو ہے نا...نکڑ والی پاکستانی گروسری کی دکان وہاں بیٹھا گپیں ہانکتا تھا...کیا میں جانتی نہیں کہ وہ مارتا تھا نا تمھیں؟... مجھے سب معلوم ہے میں نے کیا دیکھا نہیں تھا؟ جب تم سرخ آنکھیں، چہرے پر نیل اور زخمی روح لئے صبح فیکٹری جاتی تھیں...گڈ لک مائی ڈیڑھ ثمینہ صدیقی... بائی بائی میرا اور تمہارا تو بہت پرانا ساتھ ہے۔ چودہ سال سے ہم ساتھ تھے...خدا حافظ ...خدا تمہیں زندگی میں خوشیاں ہی خوشیاں دے۔

اوہو! اوپر 403 نمبر میں پھر ہنگامہ ہو رہا ہے، بہت سے لڑکے لڑکیاں جمع ہیں۔ دروازہ کھلا ہوا ہے...ہلو! ہلو!..کیا کر رہے ہو تم سب..پلے کارڈ اور بینرز تیار ہو رہے ہیں، کسی جلوس کی تیاری ہے مازن ؟...کیا لکھا ہے اس پوسٹر پر "Down with Zionism"...اچھا! اچھا...یہ جلوس نکلے گا کل... ہاں ہاں اسرائیل نے پچھلے ہفتے ویسٹ بینک اور غازہ میں جو فلسطینی مارے تھے اس کے خلاف جلوس نکلے گا...مازن تمہارے کمرے میں یہ پوسٹر کتنا عجیب ہے، اس میں ایک لفافہ بنا ہوا ہے جس پر فلسطین کا پتہ لکھا ہے اور لفافے پر دنیا بھر کے ڈاک خانوں کے ری ڈائریکٹ ہونے کی مہریں لگیں ہیں اور یہ کیا لکھا ہے... Address not found...خدایا کتنا عجیب پوسٹر ہے، لرزا دینے والا...خدا تمہارا ساتھ دے، بائی! بائی...مازن، لولوا، احمد، یوسف، جان، شکیل، جارج، آرتی، بسواس، چودھری سب کو میرا پیار...خدا تمہارے خوابوں کو سلامت رکھے۔ تم سب جو بھانت بھانت کے ملکوں سے آ کر اس کمرے میں جمع ہو کر انصاف مانگ رہے ہو، خدا تمہارا مشن کامیاب کرے... مازن میں دعا کرتی ہوں کہ تمھیں اپنے گھر جانا نصیب ہو..

کہاں ہے تمہارا گھر؟...جارڈن...مصر...کویت... فلسطین یا کناڈا......خدا حافظ۔

ہلو مسٹر Adam! کیسے مزاج ہیں آپکے میں تو آپ سے ملنے آئی تھی، میری آخری رات ہے نا یہ...اچھا لگتا ہے کہ آپکے پڑوسی مسٹر وانگ چو نے کوئی نئی چائینز ڈش پکائی ہے۔آپ اسلیئے خفا ہیں...آپ کو ان کے کھانوں کی بو اچھی نہیں لگتی...اچھا یہ بات نہیں، پھر کیا ہوا؟...اچھا!اچھا ...کل آپ جب پوسٹ آفس گئے تو وہاں کسی نے آپ سے انگریزی میں بات نہیں کی۔سب فرنچ بول رہے تھے، مسٹر وانگ یہ کیوبک Quebec ہے لوگ تو فرنچ ہی بولیں گے...آپ نے فرنچ نہیں سیکھی ذرا سی بھی۔اچھا!...آپ انگلینڈ واپس جانا چاہتے ہیں...گڈ لک...اوہو! یہ فریم میں تصویر ہے آپکی پرنس ڈائینا کے ساتھ، بہت خوب! آپ ان سے ملنے ٹورانٹو گئے تھے، وہ مانٹریال تو آئی نہیں تھیں...، کتنے کمزور ہو گئے ہو تم، مسز Adams کی برسی ہے آج...چلو میں تمہارے ساتھ چلوں ان کی قبر پر پھول چڑھانے؟...مسٹر آدم! مت اداس ہو، یہ ہی زندگی ہے...خدا حافظ۔

ارے! صبح کی پو پھٹ چکی ہے...رات ختم ہو گئی......کہاں گئے سب لوگ...یہ کیسا سناٹا ہے۔سب کمرے کیوں سائیں سائیں کر رہے ہیں، کونوں میں جالے لگے ہیں...مسز ملز، ثمینہ، مسٹر اسلام، میری این، مسٹر آدم، مازن...مسز کنفارڈی...سب کہاں گئے...ٹوٹی کھڑکیوں سے ہوا سیٹیاں بجاتی اندر آ رہی ہے...سامنے کے مین گیٹ پر چوبی تختہ جڑا ہے...سارے مکین تو چلے گئے یہاں سے...ان سب کو گئے تو اب مہینے بھر سے زیادہ ہو گیا، انہیں تو میونسپلٹی نے نوٹس کب کا دے دیا تھا...سب نے کوشش تو بہت کی، مگر بے سود...دھرنا بھی دیا تھا لوگوں نے یہاں...مگر بے کار۔

وہ خوفناک مشینیں رات ہی کو آ گئی تھیں۔خدا حافظ 460 Aylmer اسٹریٹ...اب تیرا وجود کہاں ہوگا...... تیری تو کل آخری رات تھی، صبح ہو گئی آج تجھے مسمار کر دیا جائے گا... 400 ڈالر مہینہ کرائے کے مکانوں کی کیا ضرورت ہے اب...... یہاں تو نئے Condomiuim بنیں گے ہر اک 200,000 ڈالر سے کم کیا بکے گا...مگر یہ سب میرے دوست کہاں جائیں گے۔مسز ملز کو، میری این کو، جارج کو، ثمینہ کو، مسٹر اسلام کو کہاں ملے گا گھر اتنے کم پیسوں میں ...مجھے کسی سے اب کیا واسطہ... مشینیں گھڑ گھڑانے لگیں...دھماکے...خدا حافظ 460 Aylmer Street کل مجھے ملبے میں ڈھونڈنے کی کوشش نہ کرنا۔

☆☆

قصوروار

دھائیں... گولی چلنے کی آواز... بند کمرے سے بلند ہوتی ہوئی چیخ... کال بیل بج رہی ہے... مسز شیخ؟... سامنے پولیس آفیسر اپنی ٹوپی اتار کر سر جھکا کر کہہ رہا ہے... I have a bad news for you... یہ خط ہے آپ کے نام... پھر کہیں گولی چلی... ثروت گھبرا کر اٹھ بیٹھی، سارا جسم پسینے سے تر ہو رہا تھا گھڑی میں صبح کے چار بجے تھے، ندا اور ارشد اپنے کمرے میں سوئے ہوئے تھے... اف یہ خواب کب میرا پیچھا چھوڑے گا... سامنے ڈریسنگ ٹیبل کے بڑے سے آئینہ میں پھر اسی گھبرائی ہوئی خوفزدہ عورت کا چہرہ دکھائی دیا جسے ثروت کب کا دفن کر چکی تھی... نہیں ...اس نے غور سے وہ چہرہ دیکھا... نہیں یہ تو محض خواب تھا اور یہ خواب اب مجھے کبھی نہیں ڈرائے گا ...سن لو انصار شیخ۔

''یہ ہیں میرے چھوٹے بھائی انصار شیخ، کناڈا سے آئے ہوئے ہیں'' تمہارے بھائی نے تمہارا تعارف کرایا تھا۔

کراچی کی وہ سہ پہر مجھے اچھی طرح یاد ہے جب میں تمہارے بھائی کے پاس گئی تھی کہ ان کے پرائیویٹ اسکول میں شاید مجھے پڑھانے کی ملازمت مل جائے، میں نے بی اے اور بی ایڈ کر لیا تھا۔ اور پھر کچھ ایسا ہوا ہفتے بھر بعد تمہارے نام کی انگوٹھی مجھے پہنائی گئی۔ دوسرے ہی ہفتے شادی کا ہنگامہ اٹھا، امّی بڑی پھوپھی سے کہہ رہی تھیں۔

''لڑکا وہاں اک فیکٹری کا منیجر ہے مہینے بھر کی چھٹی پر آیا ہوا ہے، ثروت کو دیکھا تو ضد پکڑ لی کہ شادی کر کے ہی جاؤں گا اسی لئے اتنی جلدی کرنی پڑی''۔

شادی کے بعد مجھے تمہارے ساتھ ہفتہ بھر ہی رہنے کا موقع ملا، شادی کے ہنگاموں،

زیوروں، کپڑوں اور رشتہ داروں سے بچ کر جو وقت تمہارے ساتھ گذارا وہ بھی پتہ نہیں چلا... نئے نئے جذباتی اور جسمانی تجربات نے اتنا موقع ہی نہیں دیا... تم نہ ہوتے تو کوئی اور شخص ہوتا... انصار شیخ کو تو میں جان بھی نہیں پائی تھی۔ تب میں خوش ہی تھی شاید... اتنی توجہ، اتنی محبت نچھاور کی تم نے کہ میں تمہارے وجود سے ڈھک سی گئی۔ تم نے مجھ سے کہا تھا۔

''ثروت ایسے ہی خوش رکھنا مجھے کبھی غصہ نہ دلانا''۔

اور میں نے بھی تمہارے سینے سے سر لگا کر، آنکھیں بند کر کے تمہیں ہمیشہ خوش رکھنے کا یقین دلا دیا تھا، ایسا ہی تو ہوتا ہے نا افسانوں میں۔

تقریباً سال بھر بعد میرا کناڈا کا ویزا آیا، سال بھر میں نے اپنی نئی زندگی کے خوش کن تصورات میں گذار دیا، تمہارے خط تو آتے رہتے تھے... میں خوشیوں کے ہنڈولے میں جھول رہی تھی کہ اپنا گھر بناؤں گی، سجاؤں گی، جیسے چاہوں گی رہوں گی، ساس نند کا بھی جھمیلہ نہیں ہوگا... خوبصورت سلیقے منداور پڑھی لکھی تو میں تھی ہی اور تم تو تھے ہی میرے۔

وہ ستمبر کا مہینہ تھا جب میں ٹورانٹو پہنچی تھی۔ ایئر پورٹ سے نکل کر کار چوڑی شفاف سڑک پر دوڑ رہی تھی، دونوں طرف سرخ نارنجی اور پیلے پتوں سے ڈھکے درخت تھے، ڈھلوان چھتوں والے صاف ستھرے مکان تھے جن کے سامنے گاڑیاں کھڑی تھیں۔ میں کسی ایسے ہی گھر کا تصور لئے کار میں بیٹھی اپنے خیالوں میں گم تھی۔ اب کار شہر کی گنجان آبادی میں داخل ہو گئی تھی، سڑک پر بہت چہل پہل تھی، پُر رونق بازار تھے۔ اونچی اونچی عمارتیں تھیں۔ تمہارے دوست ریاض بھائی جو گاڑی چلا رہے تھے ان کی آواز نے چونکا دیا۔

''لیجئے بھابی! آ گیا آپ کا گھر''۔

ایک دس منزلہ بلڈنگ کے سامنے کار کھڑی تھی آس پاس بھی ایسی ہی عمارات تھیں۔ بلڈنگ میں داخل ہوئی تو باسی کھانے، مچھلی اور مسالوں کی بو نے استقبال کیا۔ ریاض بھائی کہہ رہے تھے۔

''اس بلڈنگ میں بہت سے دیسی لوگ رہتے ہیں''۔

چھٹی منزل پر میرا گھر دو کمروں کا فلیٹ تھا، ایک کمرہ سونے کا اور دوسرا سٹنگ روم تھا اور سٹنگ روم کے ایک کونے میں کاونٹر کے پیچھے کچن تھا، دونوں کمرے سامان سے بھرے ہوئے

تھے۔مگر گھر بہت صاف ستھرا تھا، ریاض بھائی کہہ رہے تھے۔

''بھابھی! ہمارے انصار بھائی کو صفائی کا جنون ہے''۔

تم نے مجھے شہر گھمایا، شاپنگ سینٹر دکھائے اور پھر دھیرے دھیرے یہ نیا ملک یہ ماحول اور تم مجھ پر منکشف ہوتے چلے گئے۔تمہارے دوست مجید صدیقی کی بیوی نے مجھے تسلی دینے کے لئے بتایا تھا۔

''انصار بھائی کا اب اپنی کینیڈین بیوی سے کچھ تعلق نہیں ہے وہ تو بچی کو لے کر نہ جانے کہاں چلی گئی اس نے تو خرچے کے پیسے بھی کلیم (claim) نہیں کئے انصار سے''۔

مسز صدیقی بے چاری سمجھیں تھیں کہ تم نے اپنی پہلی شادی کے متعلق مجھے بتادیا ہوگا...میں بہت روئی تھی اس رات تنہائی میں...مگر کیا پوچھتی تم سے، اب ہو بھی کیا سکتا تھا۔

مسز خاں نے مجھے امید دلائی تھی۔

''اب انشاء اللہ انصار صاحب لگ کر مستقل مزاجی سے جاب کریں گے، آپ جو آ گئی ہیں''۔

اس طرح مجھے معلوم ہوا کہ تم مستقل مزاجی سے نوکری بھی نہیں کرتے ہو...میں نے تو تم سے یہ بھی نہیں پوچھا تھا کہ فیکٹری کے منیجر اور فورمین میں کتنا فرق ہے...چلو ایسے ہی سہی...تم نے میرے گھر والوں کو بتایا تھا کہ تم ایک فیکٹری میں منیجر ہو۔

میں نے تمہارے پل پل بدلتے موڈ اور بات بات پر مشتعل ہونے کی عادت سے بھی واقفیت کرلی۔دوسروں کے سامنے تم بہت مہذب اور پیار کرنے والے شوہر تھے نا...سب جانتے تھے کہ تم مجھے اتنا چاہتے ہو کہ کپڑے بھی اپنی پسند کے پہناتے ہو...سجا بنا کر گڑیا کی طرح اپنی خوبصورت بیوی کو لوگوں سے ملایا تھا نا تم نے...جب کہیں ہم ملنے جاتے یا ہمارے گھر کوئی مہمان آتا تو نہ جانے اس کے بعد تم کہاں سے کوئی ایسی بات ڈھونڈ نکالتے جس پر تم چیخ سکو، برتن توڑو. گالیاں دو مجھے...شروع شروع میں جب بھی تمہارے غصے کا دورہ دھیما ہوتا تو تم کہتے۔

''ثروت تم مجھے غصہ دلا دیتی ہو''۔

میں کوشش کرتی کی کوئی بات تمہارے مرضی کے خلاف نہ ہو جائے، میں خود کو یقین دلا دیتی تھی کہ غلطی میری ہی ہے شاید۔معافی کا لفظ تو تمہاری زبان سے ہی نہیں نکل سکتا تھا۔صرف

شوہرانہ حقوق کی ادیگی کو تم اپنی بدتمیزی کا ازالہ سمجھتے تھے۔ اور میں بھی خاموشی سے خود کو تمہارے سپرد کر دیتی. اس کے علاوہ کوئی چارہ تھا میرے پاس؟ میرے اندر کی عورت کرچیں کرچیں ہوتی جا رہی تھی اس کا پورا احساس تو خود مجھ کو بھی نہیں ہوا تھا۔

کناڈا پہنچنے کے دو تین مہینے بعد تم نے مجھے بھی اک فیکٹری میں کام دلا دیا تھا کیونکہ پاکستان کے ٹرپ اور شادی کے لئے تم نے ماسٹر کارڈ پر اُدھار لیا تھا جو ہر مہینے ادا کرنا تھا۔ میں دن بھر فیکٹری میں ایک بڑے سے ہال میں تیز روشنیوں میں مشین پر جُھکی سلائی کرتی رہتی تھی۔ میری طرح اور بھی عورتیں وہاں کام کرتی تھیں۔ ایک گھنٹہ لنچ اور آدھے گھنٹے کے کافی کے وقفے میں دوسری انڈین پاکستانی عورتوں سے دو چار باتیں کر کے تھوڑا دل بہل جاتا، شام کو آ کر میں کھانا بناتی، تازی روٹی پکاتی، برتن دھو کر، صفائی کر کے تھک کر اگر سونے لگتی تو تمہارا پارہ چڑھ جاتا۔ تم کام سے آ کر .T.V کے سامنے صوفے پر دراز ہو جاتے تھے نا... ہاں شاید یہ میری ہی غلطی تھی کہ تمہارے ساتھ گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کرتی۔ بیٹھ کر بلو فلمیں نہیں دیکھتی... ہاں ہاں!... تم تو حق بجانب تھے کہ مجھے دھکّے دو، میرے بال کھینچو کیونکہ غصہ کرنا تو تمہارا پیدائشی حق ہے۔ کسی ذرا سی بات پر بے قابو ہو کر تمہاری آنکھیں سرخ ہو جائیں اور تم مجھے تھپڑ مارو.. اس میں بھی میرا ہی قصور تھا نا؟ تم تو اپنے مزاج سے مجبور تھے۔ صبح کام پر جانے سے پہلے میں پھرکی کی طرح کام کرتی رہتی، تم دیر سے سو کر اٹھتے تو مجھ پر جھلاتے، کبھی چائے زیادہ گرم ہے، تو کبھی کار کی چابی نہیں مل رہی اور ظاہر ہے سب قصور میرا ہی ہوتا۔

شادی کے تین سال بعد جب ندا پیدا ہوئی تو مجھے امید ہوئی کہ بچی شاید تمہیں کچھ سدھار دے گی، ندا کو دیکھ کر مسز مجید نے کہہ دیا تھا۔

''بچی کی صورت تو بالکل انصار بھائی کی ہے بس خدا کرے مزاج ثروت کا مل جائے تو اچھا ہے''۔

ان کے سامنے تو تم مسکراتے رہے مگر ان کے جانے کے بعد قیامت آ گئی۔ میں تمہارے لئے چائے کی پیالی لے کر گئی تو تم نے ہاتھ مار کر گرا دی، میرا ہاتھ بھی جل گیا تھا۔ کیا وجہ تھی اس غصے کی میں سمجھ نہیں پائی تھی۔

تم چیخنے لگے۔

''ہاں ہاں! میں بد مزاج ہوں، برا ہوں، تم ہی اچھی ہو، جاؤ! کسی اچھے کے پاس چلی جاؤ۔ ہر ایک سے اپنی مصیبت کا دکھڑا روتی ہو گی جو آج انھوں نے یہ جملہ کہا۔''

تم نے مجھے دھکا دے دیا، میرے پاؤں میں موچ آ گئی مگر میں تم سے یہ بھی نہیں کہہ پائی کہ میں نے کبھی کسی سے تمہارے برتاؤ کا ذکر تک نہیں کیا... کرتی بھی کیسے۔ میری بھی تو بدنامی تھی، سب مجھ پر ترس کھاتے... میں لوگوں سے کیسے کہتی کہ میرا میاں مجھے مارتا ہے۔ کراچی میں مائی نصیباں کی لڑکی جیسے روتی ہوئی سسرال سے آتی تھی، سب کے سامنے رو رو کر اپنے میاں کے مظالم بیان کرتی تھی... میں ثروت جہاں، بی ایڈ پاس، کس طرح اپنے دکھوں کا بکھان دنیا کے سامنے کر سکتی تھی۔

میں میٹرنٹی کی چھٹی کے بعد پھر کام پر چلی گئی۔ تین مہینے کی بچی کو اپنی بلڈنگ میں رہنے والی ایک ہندوستانی خاتون مسز پٹیل کے پاس چھوڑ کر جاتی تھی۔ تم بچی کو پیار تو کرتے تھے مگر صرف اس وقت جب وہ کھیل رہی ہوتی تھی، رات کو جب ندا روتی تو تم مجھ پر چیخ پڑتے۔ میں تھک جاتی تھی، میری راتوں کی نیندیں پوری نہیں ہوتی تھی، مجھے اپنے حلیئے کو درست کرنے کا وقت نہیں ملتا تھا... ہاں! ہاں... یہ سب میرا ہی قصور تھا اسی لئے تمہاری بد مزاجی اور غصہ بڑھتا جاتا تھا... کبھی کوئی میرا سوجا ہوا منہ، کوئی نیل یا خراشیں دیکھ کر پوچھتا بھی تو میں کوئی بہانہ بنا دیتی تھی۔ مجھے تمہاری شکل سے نفرت ہو گئی تھی لیکن پھر بھی میاں بیوی کا ڈرامہ تو کھیلنا ہی تھا نا... جب تم مجھے چھوتے تو میں یہ تصور کر لیتی کہ یہ ثروت نہیں کوئی اور عورت ہے جو تمہارے ہاتھوں میں ہے... روز صبح میں اپنی انا کی دھجیاں بھی کوڑے کرکٹ کے ساتھ کوڑے دان میں پھینک آتی... تم بہت صفائی پسند ہو نا، بے ترتیبی تمھیں گوارا نہیں۔

ندا ابھی سال بھر کی تھی کہ تم نے نوکری چھوڑ دی۔ بقول تمہارے کہ تم کوئی بہتر نوکری ڈھونڈنا چاہتے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ سال بھر تو تمہیں unemployment Insurance کے پیسے ملنے ہی ہیں۔ اب تم صبح دس بجے سو کر اٹھتے تھے، میں صبح کام پر جانے سے پہلے تمہارا ناشتہ میز پر رکھ کر جاتی تھی، جب واپس آتی تو وہ جھوٹے برتن وہیں میز پر رکھے ملتے... بقول تمہارے تم روز ملازمت کی تلاش میں جاتے تھے۔ تم رات گئے تک بیٹھے V.C.R پر فلمیں دیکھتے تھے۔ ایک بار میں نے غلطی سے کہہ دیا کہ ذرا T.V. کی آواز ہلکی کر دو میری نیند خراب ہوتی

ہے، صبح ٦ بجے مجھے اٹھنا ہوتا ہے تو تم آپے سے باہر ہو گئے تھے۔

''بہت دماغ خراب ہو گیا ہے چار پیسے کیا کماتی ہو کہ دھونس جمانے لگی ہو...'' اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہے تھے پھر تم نے غصے سے کرسی الٹ دی، ایش ٹرے دیوار پر دے ماری... ہاں سب قصور میرا ہی تھا نا... مجھے ہی سمجھنا چاہئے کہ تم بہت Tense تھے پریشان تھے نوکری ڈھونڈ رہے تھے... میری ہی غلطی ہوتی تھی ہمیشہ... ہاں یہ اور بات تھی کہ مجھے معلوم تھا کہ تم دن بھر محلے کی پاکستانی گروسری اور ویڈیو کی دکان پر بیٹھے رہتے ہو۔ وہ دکان تو بے کار لوگوں کا اچھا خاصہ اڈا تھی۔ اسی سال نہ چاہتے ہوئے بھی ارشد میرے پیٹ میں آ گیا۔ ارشد کی پیدائش کے لئے میں نے میٹرنٹی کی چھٹی لے لی تھی۔ تم خلاف معمول بہت محبت سے آئے اور کہنے لگے۔

''ثروت اب تم بچے کی پیدائش کے بعد کام پر نہ جانا۔ بلاوجہ بچہ بھی بے بی سٹر کے پاس جائے گا، ندا تو اب نرسری جانے لگے گی اور سال بھر تک تو تم کو Unemployment کا الاؤنس گھر بیٹھے مل جایا کرے گا۔

مجھے اپنے کانوں پر کچھ یقین سا نہیں آیا، میں نے پوچھا۔

''لیکن اب آپ کو نوکری چھوڑے ہوئے ایک سال ہو گیا اب تو آپ کا بھی Unemployment کا الاؤنس بند ہونے والا ہے پھر گھر کے خرچے کا کیا ہوگا؟'۔

تم نے بہت سہولیت سے رائے دی تھی۔

''اس سے اچھا ہے کہ تم گھر پر دو چار بچوں کے بے بی سٹنگ کر لو اچھا خاصہ تمہاری تنخواہ کی برابر پیسہ مل جائے گا''۔

مگر میں اتنی بھولی نہیں تھی انصار شیخ۔ فیکٹری میں کام کرتے کرتے کناڈا کے سب قاعدے قوانین جان گئی تھی، میں سمجھ گئی تھی کہ اب تم ویلفئیر کے لئے اپلائی کرنا چاہتے ہو۔ ویلفئر وہ جو گورنمنٹ بے حد غریب لوگوں کو دیتی ہے یا ان کو جو کسی طرح کام کرنے سے معذور ہیں۔ تم کو معلوم تھا کہ گھر پر بے بی سٹنگ کروں گی تو تم سرکاری دفتر میں بتا سکو گے کہ میری بیوی کے پاس بھی نوکری نہیں ہے۔ تم کو ویلفئیر بھی مل جائے گا اور مجھے بھی پیسے ملتے رہیں گے۔ نہ جانے اس دن مجھے کہاں سے اتنی ہمت آ گئی تھی۔

''ہاں میں سمجھ گئی آپ ویلفئیر کے لئے اپلائی کرنا چاہتے ہیں''۔

سچی بات تھی مگر تمھیں مجھ سے اس جواب کی امید نہیں تھی۔تم غصے سے بے قابو ہو گئے، مجھے دھکا دیا، چانٹے مارے، ندا جوڈر کر رونے لگی تھی اسے دھکا دیا، بے چاری بچی کے منہ سے خون نکلنے لگا۔ارشد چلا چلا کر رونے لگا تھا۔ پڑوسی جو تمہاری چیخ پکار سننے کے عادی تھے مگر وہ بھی اس دن کے ہنگامے سے چوکنا ہو گئے ۔شاید پڑوس کی عورت کیرن نے پولیس کو فون کر دیا تھا۔ پولیس نے آ کر جب پوچھ تاچھ کی تو تم مکمل شرافت اور خوش مزاجی کا نمونہ بن گئے تھے۔

''جی نہیں کچھ غلط فہمی تھی دراصل بچے رو رہے تھے''۔

پھر بھی پولیس نے میری حالت دیکھ کر تمہیں تنبیہ کی تھی۔

پولیس کے جانے کے بعد تم بالکل پاگل ہو گئے تھے۔وہ رات تو میں اپنے تصور میں بھی نہیں لا سکتی اب...صرف اتنا یاد ہے کہ جب تم غیض و غضب میں دروازے کو ٹھوکر مار کر باہر گئے تھے،تو میرے سر سے خون نکل رہا تھا، ہاتھ میں موچ آ گئی تھی، دونوں بچے رو رہے تھے...اور اس بار میں نے پولیس کو فون کیا تھا...اور اس بار میں مکمل طور پر پرسکون تھی۔

اس رات میں نے نہ صرف تمہارا گھر چھوڑا تھا بلکہ نئی زندگی میں قدم رکھا تھا۔مصیبت زدہ عورتوں کے لئے بنائے گئے Shelter نے مجھے پناہ دی تھی۔تم نے کسی نہ کسی طرح میرا پتہ لگا لیا اور بہت سے پیغام بھجوائے میرے پاس۔ کبھی دھمکایا، کبھی بچوں کو چھیننے کی دھمکی دی...مگر انصار شیخ میں سمجھ گئی ہوں کہ تم ایک بزدل انسان ہو...مجھے کیا دھمکاتے ہو...یہ تمہاری بزدلی ہی تو تھی جو تمہیں میرے اوپر ہاتھ اٹھانے کے لئے مجبور کرتی تھی تم میں ہمت نہیں تھی جو سچائیوں کا اور اپنی کمزوریوں کا سامنا کرتے۔

پھر تم نے ایک اور بزدلی کا مظاہرہ کیا۔خود کو شوٹ کر لیا۔میرے نام ایک خط چھوڑ گئے کہ میں تمہاری موت کی ذمہ دار ہوں...میں زندگی کو دوبارہ سے گرفت میں لینے کی کوشش کر رہی تھی کہ تم نے پھر مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ میں راتوں کو سوتے سوتے چیخ پڑتی تھی، دیوانی سی ہو گئی تھی۔ تب سوشل ورکر نے میری مدد کی تھی۔ مجھے سمجھایا تھا، جینے کو حوصلہ دیا تھا۔

آج یہ خواب مجھے پھر دہلا گیا...نہیں انصار شیخ!...اب تم مجھے ڈرا نہیں سکتے...زندگی سے اس طرح لڑی ہوں کہ میں جان گئی ہوں کہ میرا قصور تھا ہی نہیں۔ ہاں! تم ذہنی مریض تھے... کورٹ نے اگر بچوں کی کسٹوڈی تمھیں نہیں دی اس میں میرا کیا قصور؟...تم نوکری نہیں کر سکتے

تھے، اس میں میرا کیا قصور... اپنی پہلی بیوی اور اپنی بچی کو تم کیسے بھول گئے، کبھی جا کر ڈھونڈ تے انھیں بھی... تمہارا احساسِ جرم تھا جو تمھیں دیوانہ بنائے رکھتا تھا۔ تم نے خود کو ختم کرلیا کیونکہ تم ذہنی بیمار تھے.. ناکارہ تھے۔

میں نے اپنے دونوں بچوں کو پال پوس کر جوان کر دیا ہے... ہاں میں نے ان پر یہ احسان ضرور کیا ہے کہ انہیں ایک ذہنی مریض اور بزدل باپ سے اور اک روز ذلیل ہوتی ہوئی ماں سے نجات دلا دی۔ میں نے اپنے بچوں کو سب کچھ بتا دیا ہے۔

رانی

"چائے گرم" - "چائے گرم" کی آوازیں لگاتے ہوئے ہاتھ میں ساوار اٹھائے ہوئے چائے والوں کی صدائیں، گاڑی سے اترنے اور چڑھنے والوں کی بدحواسی، قلیوں کا مسافروں کے سامان پر جھپٹنا، ٹھیلے پر انگیٹھی رکھے ہوئے پوریاں تلتے ہوئے مہاشے جی... ہاتھرس کے ریلوے اسٹیشن پر اس کے سوا اور کیا دیکھنے کی امید کی جاسکتی تھی۔

رضی نے ٹرین سے اتر کر پلیٹ فارم پر نظر دوڑائی، بک اسٹال پر فلمی رسالے اور ہندی کے ناول سجے تھے، آس پاس منڈلاتے چند ہیرونما لڑکے بار بار کنگھا جیب سے نکال کر بال بنا رہے تھے... اس کا دل بجھ سا گیا۔ رضی خود سے الجھا جا رہا تھا۔

"یار! یہ نوکری بھی عجیب واہیات چیز ہے... خیر ملی تو خدا خدا کر کے"۔

بینک کا امتحان پاس کرنے کے بعد اس کی یہ پہلی پوسٹنگ تھی تنخواہ بھی بڑی نہیں تھی۔ سال بھر بعد بہتر جگہ تبادلہ ہو جانے کی آس لئے آج وہ ہاتھرس میں وارد ہوا تھا۔

"مگر یار! ہاتھرس" رضی نے سر کھجاتے ہوئے سوچا "کیسی غیر رومانی سی بات ہے ،کوئی پوچھے کہ بھئی آپ کہاں رہتے ہیں...... ہاتھرس میں!"۔

ٹرین روانہ ہو چکی تھی اسٹیشن پر چھائی ہوئی بے کیفی میں کچھ اور ہی بھی ضافہ ہو گیا تھا۔ باہر نکل کر دیکھا تو بالکل وہی نقشہ تھا جو کسی بھی چھوٹے شہر کا ہو سکتا ہے۔ حلوائی کی دکانوں پر کڑھاؤ میں اونٹتا ہوا دودھ، کڑھائی میں سموسے تلے جا رہے ہیں، ایک طرف پیلی پیلی جلیبیاں مکھیوں کی دعوت کر رہی ہیں، چائے کے ڈھابے پر رکھی ہوئی خستہ حال لکڑی کی بنچیں۔ دکانوں کے تختوں کے نیچے وہی کوڑے کے مانوس ڈھیر اور ان میں بیٹھے ہوئے مریل کتے۔ اسٹیشن سے

باہر نکلتے ہی رکشہ والوں نے قلی کے سر سے رضی کا سامان جھپٹ لیا۔ایک رکشہ والا سوٹ کیس اور بیگ اپنے رکشے میں رکھ چکا تھا دوسرا بستر بند لے کر دوسری طرف چل دیا چاروں طرف ہنگامہ سا مچا تھا۔

''بابو جی!ادھر آؤ''

بھائی صاحب یہاں آ جاؤ......کہاں جانا ہے؟''

دفعتاً اسے اجنبیت کے احساس نے شدید اداس کر دیا۔علی گڑھ کے اسٹیشن پر منظر تو تقریباً یہی ہوتا تھا ایسے ہی خستہ حال رکشے والے،لیکن آوازیں مختلف ہوتی تھیں۔

''آیئے میاں،میں لئے چلتا ہوں،کہاں جائیں گے؟''

''V.M ہال یا S.S ہال''۔

جانے پہچانے رکشے والے آواز دیتے تھے ...اور پھر گرلز کالج کی لڑکیوں کی آمد ورفت...رضی نے سر جھٹک کر حال میں آنے کی کوشش کی۔

دونوں رکشے والے اب بھی رضی کے سامان کو مسئلہ کشمیر بنائے ہوئے تھے وہ الجھ گیا۔

''چلو بھاگو دونوں۔مجھے نہیں جانا کسی کے ساتھ''۔

اتنے میں ایک رکشہ والا جو سب سے الگ کھڑا تھا بڑھا اور بڑے اعتماد سے رضی کا سامان اٹھایا۔

''ادھر آیئے نا بابو جی''۔

اس آواز نے اسے چونکا دیا۔وہ ایک عورت کی آواز تھی اس نے بش شرٹ پتلون پہنی ہوئی تھی۔اور سر پر چار خانے کی چادر اوڑھی ہوئی تھی جس سے تھوڑا سا منہ چھپا ہوا تھا۔

''کہاں جانا ہے بابو جی!'' وہ پوچھ رہی تھی۔

''ارے بھئی تم رکشہ چلا لوگی...سامان کافی ہے'' اس نے سامان رکشہ میں رکھ دیا تھا ادھر سے کسی رکشہ والے کی آواز آئی۔

''سالی!پھانس لیا نا سواری کو۔ارے دھندا کیوں نہیں کر لیتی آئی ہے سالی رکشہ چلانے''۔

عورت نے کوئی نوٹس نہیں لیا۔رضی نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے رکشہ میں بیٹھ گیا۔سوچ رہا تھا کہ نہ جانے کہاں پھنس گیا۔

''شہر میں نئے لگتے ہو بابو جی''۔ وہ کہہ رہی تھی۔

رضی بے ارادہ ہی پوچھ بیٹھا۔

''رکشہ کیوں چلاتی ہو''۔

''آپ نوکری کیوں کرتے ہو''۔ اس نے بہت اطمینان سے جواب دیا۔

رضی کو چپ رہتے ہی بن پڑی۔ دل تو چاہ رہا تھا کہ اس عورت کے بارے میں سب معلوم کرلے۔ عجیب الجھن تھی، تجسس تھا۔

رکشہ گورنمنٹ کالج کے اسٹاف کوارٹر کے سامنے رک گیا، رضی کے لئے گپتا جی کا مکان ڈھونڈنا کوئی مشکل کام نہ تھا۔ کوارٹر نمبر تو معلوم ہی تھا۔ گپتا جی ابا کے الہ آباد کے زمانے کے کلاس فیلو تھے، جب رضی کو ہاتھرس میں نوکری ملی تو ابا نے گپتا جی کو خط لکھ کر اس کی آمد کی اطلاع دے دی تھی اور ان سے کہا تھا کہ وہ ہی کہیں مناسب جگہ اس کے رہنے کا انتظام کردیں۔ گپتا جی اور ان کی بیوی بہت محبت سے ملے۔ ان کے نوکر نے سامان اٹھالیا، رضی نے رکشہ والی کو دس کا نوٹ دیا تو اس نے پانچ روپئے واپس کردیئے، رضی کے اصرار پر بھی واپس نہیں لئے۔

''بابو جی عزت کی روٹی کماتی ہوں''۔ اس نے کہا اور رکشہ کے پیڈل مارتی ہوئی چل دی۔

مسز گپتا بولیں۔

''یہ تو ہے ہی باؤلی۔ بھلا یہ بھی کوئی کام ہے عورت کے کرنے کا''۔

رضی نے بینک میں ملازمت سنبھال لی۔ خاصی بوریت کا سامان تھا۔ ہال میں رکھی متعدد میزوں پر بیٹھے ہوئے بابو لوگ، میلے میلے رجسٹروں سے بھری الماریاں، موٹے موٹے شیشے کے گلاسوں میں ڈھابے کی چائے پیتے، سفاری سوٹ پہنے، پان چباتے لوگ... ان کی ٹپکل دفتری گفتگو۔ رضی نے جیسا سوچا تھا بینک کا ماحول بالکل ویسا ہی تھا۔

ایک ہفتے بعد گپتا جی نے ایک چھوٹے سے مکان کا انتظام کرادیا، کھانا ہوٹل میں کھانا پڑتا تھا البتہ اتوار کے دن مسز گپتا اصرار کرکے کھانا اپنے ساتھ کھلاتیں تھیں۔ یوں ہی کسی نہ کسی طرح زندگی گھسیٹنی پڑ رہی تھی۔

اس پورے عرصے میں اس سے صرف ایک بار ملاقات ہوئی۔ اُس روز وہ اسی کے رکشہ میں بیٹھ کر بینک آیا، اس کی پروقار خاموشی اور ایک خاص پروفیشنل سا انداز برقرار تھا، اس

دن رضی نے اس سے اس کا حال پوچھا تو اتنا ہی مختصر جواب پایا۔

''کرپا ہے بھگوان کی بابو جی''۔

رضی نے اسے غور سے دیکھا، ۲۹ یا ۳۰ سال کی ہوگی یا شاید اس سے بھی کم، نقشہ بہت معمولی تھا، ہاتھ پاؤں کی مضبوط تھی۔ سڑک پر آتے جاتے وہ اکثر نظر آ جاتی تھی۔

ہاتھرس تھا ہی کون سا بڑا شہر۔ ایک دن صبح پھر اس کے ہی رکشہ میں آنا ہوا، اس بار گفتگو کا آغاز اس نے ہی کیا۔

''تو آپ بینک میں کام کرتے ہو بابو جی!''۔

پھر نہ جانے کیسے صبح اکثر بینک جانے کے لئے اس کا ہی رکشہ مل جاتا مگر ہر بار رضی کو عجیب سی خجالت ہوتی رکشہ پر بیٹھ کر، ایک تو یوں ہی ایک انسان کا دوسرے انسان کا بوجھ ڈھونا تکلیف دہ بات ہے اور پھر وہ بھی ایک عورت رکشہ چلائے۔

ایک روز اس نے خود ہی بات شروع کی۔

''بابو جی سنا ہے بینک قرضہ دیتی ہے غریبوں کو؟''

ہاں دیتی تو ہے کیوں کیا تمہیں چاہیئے، کیا کرو گی''۔

رضی کافی ایکسائٹیڈ سا ہو گیا۔ شاید وہ یہ کام چھوڑ کر کوئی اور دھندا شروع کرنا چاہتی ہو۔

''بابو جی میں خود اپنا رکشہ خریدوں گی۔ 25 روپیہ روز تو رکشہ کا کرایا ہی دینا پڑتا ہے''۔

اس نے کہا تو رضی بجھ سا گیا۔ اسے تو یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ رکشہ چلانے والوں کے رکشے بھی اپنے نہیں ہوتے۔

رضی نے پوچھ ہی لیا آخر۔

''تم رکشہ کیوں چلاتی ہو کوئی اور کام کیوں نہیں کرتیں''۔

اس نے رکشہ چلاتے چلاتے مڑ کر کہا۔

''رکشہ نہ چلاؤں گی تو تیرے میرے گھر جا کر لوگوں کے جھوٹے برتن مانجھوں، جھاڑو دوں، گھر والیوں کی دھونس سہوں، نہ بابو جی! یہ رانی کے بس کا روگ نہیں''۔

اس دن پہلی بار رضی کو اس کا نام معلوم ہوا۔ وہ خود کو رانی کہتی تھی۔

رضی کو آج سب کچھ ہی پوچھ لینا تھا بولا۔

''رانی! کوئی اور نہیں ہے تمہارا''۔

''بابو جی آپ یہ پوچھنا چاہتے ہو کہ رانی! آدمی کہاں ہے تمہارا''۔

رضی نے محسوس کیا کہ جیسے وہ یہ کہتے ہوئے زیر لب مسکرا رہی ہو، وہ شرمندہ سا ہو گیا، وہ کہہ رہی تھی۔

''جی ہے آدمی میرا، پر اب کہاں ہے پتہ نہیں زندہ ہے کہ مر گیا ہوگا'' وہ اطمینان سے رکشہ چلاتے ہوئے بولی ''میں نے چھوڑ دیا اسے''۔

رضی کا خیال تھا کہ وہ کوئی درد بھری داستان سنائیگی۔ لیکن وہ تو بڑے مزے سے یوں بتا رہی تھی کہ جیسے یہ عام بات ہو۔ وہ آج بولنے کی موڈ میں تھی۔

''رام دئی تھی میں، میرا نام تھا رام دئی... ڈبائی کے پاس گاؤں میں گھر تھا میرا، ماں مر گئی باپ نے شادی کر دی میری ۱۶ سال کی عمر میں، نکھٹو تھا میرا مرد... بمبئی گیا تھا کمانے، دو برس کے بعد آیا دھیلا نہیں کما کر لایا۔ ایک چھوٹا سا کھیت تھا سو وہ بھی بیچ کر کھا گیا۔ کبھی کبھی فصل کے زمانے میں مزدوری کرتا تھا باقی وقت گھر میں پڑا رہتا تھا... مجھے تاڑی پی کر پیٹتا تھا سو الگ''۔

اس کے رکشے کی چین اُتر گئی وہ زمین پر اُکڑوں بیٹھ کر چین چڑھاتے ہوئے کہتی رہی۔'' آپ ہی بتاؤ بابو جی! یہ بھی کوئی بات ہوئی ... میں اس کے بچے جنوں، کھانا پکاؤں، مار کھاؤں...تو بس بابو جی! بچے کو ساتھ لیا اور نکل آئی گھر سے ... اگر وہاں رہتی اس کے پاس تو بھگوان جانے اور کتنے بچے ہو جاتے میرے۔ یہاں ہاتھرس میں میرا ماما تھا اس کے پاس آ گئی... سال بھر آس پڑوس کے دو تین گھروں میں جھاڑو برتن کئے، سارا دن کھٹتی تھی اور مہینے میں ہاتھ آتے تھے تین سو روپے اور بچا کچا کھانا... سو میں نے کہا رانی بس چھوڑ دے یہ گھس گھس والی جندگی اور میں نے چالو کر دیا رکشہ... بس بابو جی وہ لون (Loan) مل جاتا...''۔

رضی حیران تھا کس قدر میٹر آف فیکٹ طریقے سے اس نے اپنی زندگی کی داستان سنا دی۔ گویا اپنی زندگی پر اس کی کڑی گرفت ہو۔

رانی جب بینک میں لون (loan) کے درخواست دینے آئی تو ساڑھی پہنے ہوئی تھی ساتھ میں اس کا سات سالہ بچہ بھی تھا۔ ساڑی پہن کر اچھی بھلی عورت لگ رہی تھی۔ اتنی بدصورت بھی نہیں تھی۔ بینک میں قریب ہی میز پر بیٹھے یادو جی نے آنکھ مار کر رضی سے کہا۔

''بہت ٹھیک جا رہے ہو رضی صاحب''۔

رانی کو لون دلوانے کے لئے رضی نے خود ضمانت لی اور اسی کا ڈھائی ہزار روپے کا لون منظور ہو گیا۔ رضی نے سمجھا بجھا کر رانی کو راضی کر لیا کہ وہ رکشہ چلانا چھوڑ دے اور اک ڈھابہ کھول لے۔ رانی نے یہ بات مان ہی لی۔ اسٹیٹ بینک کے سامنے چوارہے پر کافی آمدورفت رہتی تھی قریب میں اور دکانیں بھی تھی وہیں نیم کے نیچے رانی نے اپنا چولہا جما دیا اور اس کا ڈھابہ چلنے لگا۔ اب وہ اکثر ساڑھی پہننے لگی تھی۔ چند ماہ بعد رضی کا تبادلہ الہ آباد ہو گیا اور امی نے ضد کر کے دوسرے سال شادی بھی کرا دی۔ ہاتھرس سے گپتا جی کی چھوٹی بیٹی کی شادی کا کارڈ آیا تو ابا نے رضی کو بھیجا۔ گپتا جی کے گھر شادی میں شرکت ضروری تھی کیونکہ انھوں نے ہاتھرس میں رضی کا بہت خیال رکھا تھا۔

ہاتھرس جانے کے خیال کے ساتھ ساتھ رانی کی یاد بھی پھر سے تازہ ہو گئی۔ رضی سوچنے لگا نہ جانے اب اس کا ڈھابہ کیسا چل رہا ہوگا۔ گپتا جی کے گھر شادی کے ہنگاموں میں بینک جانے کا موقع ہی نہیں ملا۔ شادی کے بعد گپتا جی کو کچھ فرصت ملی تو رضی نے ان سے رانی کا حال پوچھا، مسز گپتا نے کہا صبح کراؤں کی تمہاری ملاقات رانی سے۔

دوسرے روز صبح دس بجے رضی کو واپس جانا بھی تھا اس لئے جلدی اٹھ گیا۔ صبح کے سات بجے ہونگے گپتا جی کا پوتا منیش اسکول کے لئے تیار ہو گیا تھا باہر سے عجیب وغریب کھڑ کھڑاہٹ کی آواز آئی منیش بھاگ کر باہر چلا گیا، مسز گپتا نے آواز لگائی ''دیکھو کون آیا ہے''۔

رضی باہر نکلا تو دیکھا دروازے پر ایک رکشہ گاڑی کھڑی ہے سائیکل رکشہ میں ایک کٹہرے نما چیز لگی ہوئی تھی جس میں اسکول کے بچے بیٹھے ہوئے تھے۔ رانی خاکی پتلون اور شرٹ میں ملبوس گپتا جی کے پوتے کو اس کٹہرے نما گاڑی میں ٹھونس رہی تھی۔

''ارے رانی''۔ رضی حیران رہ گیا۔

''بابو جی! آپ کہاں... کیسے ہو؟

رضی نے پوچھا۔

''یہ سب کیا ہے رانی... پھر وہی رکشہ''۔

''نہیں بابو جی رکشہ نہیں۔ یہ دیکھئے رانی ٹرانسپورٹ''۔

اس نے رکشہ گاڑی کے سائیڈ میں ہندی اور انگلش میں لکھے ہوئے ''رانی ٹرانسپورٹ'' کی طرف اشارہ کیا۔

رضی نے پوچھا۔ ''ڈھابے کا کیا ہوا؟''

''بس بابو جی! بیچ دیا''

رانی اپنے مخصوص میٹر آف فیکٹ انداز میں کہہ رہی تھی۔

''بہت بک بک جھک جھک ہوتی تھی، سالے سب وہاں بیٹھ کر اڈا لگاتے تھے...گالی گلوج کرتے تھے بدمعاش...بس بیچ ڈالا وہ ڈھابہ اور یہ اسپیشل رکشہ چالو کر دیا۔ یہ رانی ٹرانسپورٹ''۔

اس نے فخر سے اپنی کٹہرے نما گاڑی تھپتھپائی۔

''اور ہاں بابو جی لون سب ادا کر دیا''۔ وہ بولی

رانی نے ایک بچے کو گاڑی میں سے کھینچ کر نکالا اور بولی۔

''لکی رام! بابو جی کو نمستے کرو۔ یہ تیرے ماما لگتے ہیں''۔

گیارہ سالہ صاف ستھرے نیکر بشرٹ میں ملبوس، پانی کی بوتل اور بستہ گلے میں ڈالے لکی رام نے نمستے کے بجائے کہا۔

''گڈ مارننگ''۔

رانی نے فخر سے کہا۔

''انگلش میڈیم اسکول جاتا ہے نا''۔

پھر بچے کو ڈانٹ کر بولی۔

''پیر چھوا اپنے ماما جی کے''۔

☆☆

واپسی کا سفر

ائیر پورٹ کے لاؤنج میں بنے ہوئے کیفیٹریا کی بڑے بڑے شیشوں والی کھڑکی سے باہر کا منظر ایک تصویر کی طرح نظر آ رہا تھا۔ باہر دور تک برف کی چادر پھیلی تھی، بے برگ درختوں کی شاخوں پر کہیں کہیں برف اٹکی ہوئی تھی، دور بہت دور سڑک کے اس پار کسی تنہا مکان کے دروازے پر کرسمس گذر جانے کے ہفتے بھر بعد بھی کرسمس کی لائٹس جل بجھ رہی تھیں۔ برف روئی کے گالوں کی طرح دھیرے دھیرے گر رہی تھی... بے آواز، بالکل جیسے وقت دبے پاؤں گذر جاتا ہے۔ اس خوبصورت برف زار میں ہم نے دس سال یوں ہی غیر محسوس طریقے سے گذار دیئے تھے۔ میں نے چھنگلی سے آنکھوں کے کنارے آیا ہوا آنسو چپکے سے پوچھ ڈالا، شیشے کے دوسری طرف تصویر کی طرح ساکت منظر میں دل میں بسا لینا چاہتی تھی۔ مجھے اپنے اوپر غصہ آنے لگا۔ نہ جانے کیوں مناظر، لوگ، باتیں، رشتے، میں بھولنا چاہوں بھی تو بھلا نہیں سکتی۔

راہول نے گروپ فوٹو لینے کے لئے سب کو متوجہ کیا۔

''ذرا مسکرانے کی کوشش کی جائے... ایک الوداعی تصویر''۔

ہمارے سارے دوست، لیاقت، ظہیر، درشی، نعیم، رشید، راہول اور جولین ہمیں رخصت کرنے ائیر پورٹ آئے تھے۔ ''کلک'' کیمرے کا بٹن دبا اور فلیش کی روشنی جل بجھی ظہیر نے اپنے سوئے سوئے لہجے میں کہا۔

''اوئے! فکر مت کرو اگلے سال ائیر پورٹ پر شمع باجی اور ارشد بھائی کو لینے ہم سب موجود ہوں گے''۔

نعیم نے ظہیر کو ڈانٹا۔

"اچھا بکواس بند کرو۔ خواہ مخواہ جانے والوں کے دل میں وسوسے مت ڈالو، کون جاتا ہے سب آرام چھوڑ چھاڑ کر اپنے وطن۔ میں بھی سوچ رہا ہوں کہ اب کناڈا کو خیر باد کر کے پاکستان چلا جاؤں"۔

رشید نے ہنس کر کہا۔

"سائیں! یہ ارادہ تو تم پچھلے پندرہ سال سے کر رہے ہو۔ چین سے پڑے رہو جہاں ہو"۔

راہول نے کہا۔

"باجی آپ مجھے ہندوستان سے نئے اور اچھے ڈراموں کے اسکرپٹ بھیجئے گا، ویسے ہمارا گروپ "تیسری دنیا" کوئی بھی نیا ڈرامہ کرتے وقت آپ کو بہت یاد کرے گا۔"

ظہیر نے ہنس کر کہا۔

"یار یہ تو اب خود ہی بہت بڑے ڈرامے میں کردار نبھائیں گے، ڈرامے کا عنوان "حب الوطنی"۔ کہانی میں قوم کی محبت کا مارا ہیرو عیش و آرام تج کر، وطن کی مٹی کی پکار پر باہیں پھیلائے دوڑا جاتا ہے... ڈرامے کے انجام کے لئے سامعین ایک سال کا انتظار کریں"۔

درشی نے اپنے میاں ظہیر کو ڈانٹا۔

"ظہیر کبھی تو سیریس ہو جایا کرو"۔

رشید نے آہستہ سے پوچھا۔

"ویسے ارشد بھائی آپ امیگریشن سے ایک سال کی اجازت لے کر جا رہے ہیں نا۔ کہیں انڈیا میں کچھ گڑبڑ ہو جائے تو کم سے کم واپسی کا راستہ تو کھلا رہے، دس برسوں میں بھی آپ نے کناڈا کا پاسپورٹ بھی نہیں لیا"۔

ارشد نے کہا۔

"یار ہزار بار تم سب کو بتایا ہے کہ میں کینیڈین پاسپورٹ حاصل کرنے کے لئے اپنی ہندوستانی شہریت ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ ہاں! وہ ریٹرننگ ریذیڈنٹ (Returning Resident) پرمٹ سال بھر کا تو لے لیا ہے۔ ایک بار واپس آ کر سب بینک وغیرہ کے اکاؤنٹس تو بند کرانے ہوں گے"۔

نعیم نے ذرا گلو گیر انداز سے کہا۔

''آپ دونوں کی کمی بہت محسوس ہوگی اتنے دنوں کا ساتھ تھا، خدا آپ لوگوں کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے''۔

سب لوگ اداس سے ہو گئے۔

ظہیر نے پھر مسخرے انداز سے ماحول کو ہلکا بنانے کی کوشش کی۔

''ویسے یار ارشد تمہارے کتبے پر لکھا جائے گا کہ مرحوم کو ملک وقوم کی خدمات کا بہت شوق تھا اسی میں جاں بحق ہوئے''۔

''خدا کے لئے! ظہیر ذرا تو کبھی سنجیدہ ہو جایا کرو، سفر پر جاتے وقت منحوس باتیں مت کرو''۔ درشی نے پھر اپنے میاں کو ڈانٹا۔

ہماری فلائٹ کا اعلان کئی بار ہو چکا تھا میں نے سب کو خدا حافظ کہہ کر جلدی سے ایئر بیگ اٹھالیا اور پھر تیزی سے اندر داخل ہو گئی، میں مڑ کر نہیں دیکھنا چاہ رہی تھی۔

جہاز رن وے پر تیزی سے دوڑ رہا تھا، جیسے میری طرح جلد از جلد یہ زمین چھوڑ دینا چاہتا ہو... پلٹ کر دیکھنے سے اب کیا فائدہ ... جہاز اڑان بھر کر اب عین شہر کے اوپر اڑ رہا تھا۔ رات کے دس بجے تھے میں نے نیچے دیکھا... لمبی لمبی متوازی روشنیوں کی لکیروں کی شکل میں پھیلی ہوئی سڑکیں جن پر میں نے نہ جانے کتنی بار سفر کیا ہوگا۔ گرمی کے موسم میں اِن صاف ستھری خوش باش راہوں پر میں اکثر یوں ہی اکیلی اپنے آپ میں گم چلتی رہتی تھی۔ سردی میں اِن برفیلے راستوں پر بھاری بوٹ پہنے گرتے پڑتے چلنے کا مزہ ہی الگ ہوتا تھا اور پھر خزاں کا موسم... وہ دلنواز موسم... خزاں شروع ہوتے ہی (Maple) میپل کے درختوں میں جیسے آگ لگ جاتی ہے۔ لال، پیلے، نارنجی پتوں سے بھرے میپل کے جنگل تو میرے وجود کا حصہ بن چکے ہیں۔ میں اور ارشد کار میں لمبی ڈرائیو پر نکل جاتے... جہاز اب منجمد ہوئے دریا کے اوپر اڑ رہا تھا، اندھیرے دریا کے بیچ میں روشنیوں کی ایک کہکشاں تھی۔ یہ شامپلین (Champlain) کا پل ہے شاید... تھوڑی دور پر سینٹ جوزف چرچ کے اونچے گنبد اور بے شمار سیڑھیوں پر برقی روشنیوں سے چراغاں کا سماں تھا۔ اونچی کرسی پر بنے بے شمار سیڑھیوں والے اس شاندار چرچ کو دیکھ کر مجھے ہمیشہ یہ خیال آتا تھا کہ کاش میری دہلی کی پرشکوہ جامع مسجد کی سیڑھیاں بھی کاٹ کباڑ سے پاک ہو جائیں وہاں بھی یہ چراغاں ہو۔ جہاز اب جاں کارٹیئر (Jean Cartier) کے پُل کے اوپر

سے گذر رہا تھا۔ وہیں کہیں نیچے وہ یونیورسٹی ہے جہاں ہم نے زندگی کے کئی سال گذارے تھے۔ وہیں وہ اپارٹمنٹ ہے جس کی کھڑکی سے میں ہر رات ماونٹ رائل پر چمکتا ہوا حضرت عیسی کا برقی کراس دیکھتی تھی، جس کی روشنیاں دور سے شہر مانٹریال کا پتہ دیتی تھیں۔ جہاز اس چمکتے ہوئے کراس (صلیب) سے اب بہت دور ہو گیا تھا۔ نیچے اب تاریکی کا گہرا سمندر تھا۔

میں کھڑکی کا پلاسٹک والا شٹر گرا دیا، ارشد نے تھک کر کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کرلیں تھیں، مہینوں کی تھکن اب ہم دونوں پر غالب آ گئی تھی۔ شاپنگ، سامان اور کتابوں کے کارٹن کارگو سے بھجوانا، پیکنگ، ملنا ملانا، دعوتیں نہ جانے کتنے دنوں سے یہ سلسلہ تھا۔ ہم دونوں شاید تھوڑی دیر کے لئے سو گئے ہوں گے جب آنکھ کھلی تو جہاز میں کھانا سرو کرنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔

ارشد تھوڑے تازہ دم نظر آ رہے تھے میرا سر بھی ہلکا سا محسوس ہوتا تھا۔

ارشد کھوئے کھوئے لہجے میں بولے۔

''اس بار اعظم گڑھ جا کر اپنے گاؤں کے پرانے اسکول جاؤں گا گپتا جی سے ملنے، وہ تو اب ریٹائر ہو گئے ہوں گے.... کوئی بات نہیں ان کے گھر جا کر ملوں گا.......... پتہ ہے چار سال پہلے جب میں ہندوستان گیا تھا تب اپنے پرانے استادوں سے ملنے اپنے اسکول ''شوشنکر جی ہائی اسکول'' بھی گیا تھا۔ گپتا جی جنھوں نے ہمیں بچپن میں پڑھایا تھا وہ بہت خوش ہوئے تھے مل کر۔ میں نے جب انھیں بتایا تھا کہ میں نے اپنی پی ایچ ڈی مکمل کر لی ہے اور اب کناڈا میں یونیورسٹی میں پڑھا رہا ہوں تو گلے لگا کر بہت دعائیں دی تھیں اور کہا تھا۔

''بیٹا! ایک بات کہوں''۔ اور پھر انھوں نے یہ دوہا پڑھا تھا۔

بڑا بھیا تو کیا بھیا جیسے پیڑ کھجور
پنچھی کو سایہ نہیں پھل لاگیں اَتی دور

میں سمجھ گئی کہ ارشد ابھی مختصر سی نیند کے دوران کہیں بیتے دنوں کی سیر کر آئے ہیں... یادوں، ارادوں اور خوابوں کی ایک دھنک ان کی آنکھوں میں لہرا رہی تھی۔ نہ جانے کیوں میرا دل ڈرسا گیا، مجھے وہ ساری بحثیں یاد آ گئیں جو ہمارے ہندوستان واپس جانے کے سلسلے میں ہوئی تھیں۔ پی ایچ ڈی ختم کرنے کے بعد فوراً ہی ارشد کو مانٹریال کی ایک یونیورسٹی میں

Faculty Position مل گئی تھی لیکن ان کو چین نہیں تھا...وہ ہی پرانا خواب کہ پڑھ لکھ کر کمپیوٹر کی اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے اپنی مادر درس گاہ میں مسلمانوں کے لئے اس علم کو فروغ دوں گا۔ دوست احباب رشتہ دار سب اونچ نیچ سمجھاتے تھے کہ اتنے سال باہر رہنے کے بعد تم وہاں واپس جا کر فٹ نہیں ہو سکتے، کیوں اتنے جذباتی ہوتے ہو، عقل سے سوچو، اتنی اچھی پوزیشن چھوڑ کر جاؤ گے وغیرہ وغیرہ۔ لیکن ارشد کا برسوں پرانا خواب ان سے جدا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ میں کہتی کہ ابھی جلدی کیا ہے بعد میں چلے جائیں، اس کا جواب ہمیشہ ارشد یہی دیتے تھے۔

''بوڑھے ہو کر وہاں جائیں گے؟ جب کچھ کرنے کے قابل نہیں ہوں گے۔ تم صرف اپنی تن آسانی دیکھتی ہو ہمارا ابھی تو کوئی فرض ہے...اور پھر زندگی کا کوئی مقصد بھی تو ہو، تم ادیب وشاعر تو چاہتے ہو کہ وطن سے دور بیٹھے وطن کی محبت اور ناسٹالجیا Nostalgia کے گیت اور کہانیاں لکھتے رہو، تمہیں حقیقت سے کیا واسطہ''۔

میرا دل چاہتا تھا کہ کہوں۔

''ارشد میاں! خوابوں میں تو تم رہتے ہو، حقیقت سے نظریں تم چراتے ہو، تمہاری جذباتیت اور آئیڈیلزم کھوٹے سکے ہیں''۔

صبح جہاز (Amsterdam) کے ہوائی اڈے پر اتر رہا تھا تو سارا شہر کہرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ ہمیں یہاں سے دوسرا جہاز دہلی لے جانے والا تھا۔ یہ کہرے میں ڈوبا شہر کافی اداس سا لگ رہا تھا۔ میں نے سوچا کہ اب ہر روز روشن صبح ہندوستان میں کھلی کھڑکیوں سے اندر آ کر ہمیں جگائے گی۔ صبح اپنی مانوس آوازوں اور خوشبوؤں کے ساتھ آئے گی۔ بند کمروں میں سوتے ہیں تو صبح آنے کا پتہ ہی نہیں چلتا۔۔۔ مجھے یاد آیا کہ علی گڑھ میں صبح چھ بجے دودھ والا اپنی سائیکل پر دودھ کے ڈبے ٹانگے ہمارے لان کا پھاٹک کھولتا تھا...امی صبح نماز کے بعد چمیلی کے پھول اکٹھا کر کے لاتی تھیں۔ ایئر پوٹ کی ڈیوٹی فری شاپ میں گھومتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ مجھے ایک ہیئر ڈرائیر چاہئے۔ کاونٹر پر کھڑی ہوئی سیلز گرل سے میں نے Duel voltage والا ڈرائیر مانگا تو ارشد نے کہا۔

''تمہارے دماغ میں اب بھی 220 اور 110 والا تضاد موجود ہے۔ ہندوستان میں تو 220V ہی چلتی ہے وہی لے لو۔ دیکھو! ہم اپنی کشتیاں جلا کر جا رہے ہیں''۔

ہم دوسرے جہاز کے انتظار میں بیٹھے تھے، آج نئے سال کی صبح تھی یعنی سن ۱۹۸۹ء کا پہلا دن ۔ارشد بیٹھے اپنے بریف کیس میں رکھے کاغذ الٹ پلٹ رہے تھے۔ ایک بار پھر انھوں نے مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے آیا ہوا اپنا تقرر نامہ نکال کر پڑھا اور بولے۔

''ویسے ان لوگوں کو مجھے پروفیسر شپ دینی چاہئے تھی، کتنا تجربہ اور ریسرچ ورک ہے میرا، لیکن جانے دو...کوئی فرق نہیں پڑتا میں وہاں عہدے کے لئے تو نہیں جارہا ہوں۔ مجھے تو کام کرنا ہے''۔

نئی دہلی کے ایئر پورٹ پر جہاز شام چار بجے پہنچا تھا۔ یوں تو پچھلے دس برسوں میں ہم لوگ تین چار مرتبہ ہندوستان آئے تھے لیکن آج وطن کی سرزمین نئی سی دکھائی دے رہی تھی اک عجیب سا احساس تھا۔ پہلی جنوری ۱۹۸۹ء کا نیا دن، نیا سال...آج واپسی کا سفر شروع ہوا تھا۔ اپنے وطن کو واپسی کا سفر

وہ کہرآلود رات تھی ہم جب دہلی کے ائیر پورٹ پر کناڈا کی فلائٹ لینے کے لیئے پہنچے۔اس وقت رات کے بارہ بج چکے تھے اور نئے سال کا پہلا دن شروع ہو چکا تھا۔ پورا سال گذر گیا...پہلی جنوری ۱۹۹۰ پورا ایک برس گذر گیا۔ دہلی کے ائیر پورٹ پر حسب معمول گہما گہمی تھی ۔دبئ، کویت اور سعودی عربیہ کے لئے کئی فلائٹس ہمارے سامنے ہی روانہ ہوچکیں تھیں ۔ جہاز بھر بھر کے لوگ زیادہ پیسے کمانے پردیسوں کو سدھار رہے تھے۔

اب پسنجر لاونج میں زیادہ لوگ نہیں تھے۔ میں اور ارشد خاموشی سے بیٹھے بظاہر تو لوگوں کی آمد ورفت دیکھ رہے تھے لیکن ذہن میں واقعات کی اک فلم چل رہی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد KLM کی فلائٹ ہمیں کناڈا لے جانے والی تھی۔ میری نظروں اور دل میں ہمارے گھر کے لان کے پھاٹک پر کھڑے امی اور ابا کے دھواں دھواں چہرے بھٹک رہے تھے...ایک بار پھر میں گھر کی دہلیز پر دعاؤں کے چراغ جلے چھوڑ آئی تھی۔ پچھلے ایک برس کے عرصے میں اپنا گھر اور اپنا پرانا شہر پھر سے اپنا ہو گیا تھا۔ گرمی، بجلی کی کٹوتی، گندگی اور دوسری سہولیات کے نہ ہونے کا بھی اب کوئی فرق نہیں پڑتا تھا کیوں کہ ایک خواب لے کر آئے تھے ہم اپنی زمین پر...لیکن ایک بار پھر

وطن بدر ہونا پڑ رہا ہے... مجھے ایک دم ارشد پر غصہ آنے لگا کہ کیا ضرورت تھی اس قدر اصول پسند بننے کی... ارے بھئی جب آوے کا آوا ہی ٹیڑھا ہے تو آپ کیا تیر مار لیں گے۔ مصلحت کوشی، اور حالات سے سمجھوتا بھی تو کرنا پڑتا ہے انسان کو... زندگی کو اتھل پتھل کر کے رکھ دیا۔

ارشد اچانک ہی بول پڑے۔

''سب کے سب جھوٹے، مفاد پرست، خود غرض''۔

میں سمجھ گئی کہ یہ جملہ ان کے ذہن و دل میں چلنے والے مکالموں کی ایک کڑی ہے جو غصہ میں ابل کر باہر آ گیا ہے۔

وہ کہہ رہے تھے۔

''وہ ہمارے پرانے استاد پروفیسر انصاری فرما رہے تھے کہ بھئی مصلحت اور صلح پسندی سے کام لو، وقت پر تو گدھے کو بھی باپ بنانا پڑتا ہے... ہونہہ!... رجسٹرار صاحب ایک دن میٹنگ میں فرما رہے تھے کہ آپ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کو آکسفورڈ کیوں بنانا چاہتے ہیں... کمال ہے انھیں اتنا بھی نہیں معلوم کہ یہی تو سرسید کا خواب تھا... ٹھیک ہے بنالو یتیم خانہ اسی مادر درسگاہ کو... ہونہہ... اقلیتی کردار بنائیں گے یہ لوگ یونیورسٹی کا... اقربا پروری بے ایمانی اور تنگ نظری کا کوڑادان کہو...''

ارشد کی مایوسی غصہ اور بے بسی انہیں دیوانہ بنائے دے رہی تھی وہ ایکٹنگ کر کے بولے۔

''وہ! وہ سارے خواجہ سرا دہ کلرک یونیورسٹی کے حاکم بنے بیٹھے ہیں۔ سینئر پروفیسران کے پاس جا کر کہتے ہیں کہ... حضور ہمارا کام کروا دیں... مجھے ڈرایا جا رہا تھا کہ ڈین صاحب آپ سے خفا ہیں، آپ ابھی probation پر ہیں، سنبھل کر رہئے... ارے وہ کیا لکھیں گے میرے خلاف... یہی نا کہ میں داخلوں میں، تقرری میں اور امتحانات میں ایمان داری اور باقاعدگی چاہتا تھا۔ کمپیوٹر ڈیپارٹمنٹ کا چیئرمین ہونے کے ناطے کمپیوٹر اور دوسرے سامان کی خریداری میں پیسہ نہیں کھاتا اور نہ کھانے دیتا تھا... لڑکوں میں کچھ سیکھنے کی اُمنگ پیدا کر دی تھی... ہاں، ہاں... یہ الزام لگائیں گے کہ میں لوگوں سے لڑتا تھا... ٹھیک ہے مت کرو لوگوں سے لڑائی، بنے رہو میاں مٹھو... اور دو مٹھی خاک ڈال دو یونیورسٹی کی قبر پر...

ارشد نے اپنا بریف کیس کھولا اور اپنا طویل اور مشروط استعفیٰ نکال کر اک بار پھر

دیکھا۔ سات صفحے پر مشتمل یہ استعفیٰ انھوں نے کئی راتیں جاگ کر لکھا تھا۔

''یہ خط دیکھو'' وہ بولے

''یہ ہے وہاں کی بے ایمانیوں، بدعنوانیوں اور سیاست بازیوں کی فہرست۔ یہ دیکھو سب لکھ دیا ہے میں نے''۔

مجھے غصہ آ گیا۔

''لکھا ہوگا، مجھے کیا دکھا رہے ہو... اس تحریر کی ایک ایک لائن سے میں واقف ہوں۔ تم نے ساری رات جاگ کر خود کو جلا کر اپنے خیال میں جو فردِ جرم تیار کی ہے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سال بھر جو تم نے جھک ماری ہے تو کون سی بات تمہاری سن لی لوگوں نے جواب یہ استعفیٰ انھیں سمجھا دے گا۔''

ارشد کاغذ پلٹتے ہوئے بولے۔ ''کم سے کم فائل میں ریکارڈ میں تو رہے گا کہ کیا گڑ بڑ ہو رہی تھی۔''

''ہاں'' میں نے جواب دیا ''اور یہ فائل کسی زنگ آلود الماری میں گرد کھائے گی یا شاید تمہارے استعفیٰ کو پہلے ہی غائب کر دیا جائے۔ کیا تم کو یہاں کے حالات کا پتہ نہیں تھا۔''

ہماری فلائٹ کی بورڈنگ کا اعلان ہو گیا تھا۔ ارشد نے بریف کیس بند کیا اور اُٹھتے ہوئے بولے۔

''اگلے مہینے نئے وائس چانسلر آنے والے ہیں، دیکھو وہ اس سلسلے میں کیا کرتے ہیں میں ان کو ایک تفصیلی خط لکھوں گا۔''

میں نے اپنا ائیر بیگ کندھے پر ٹانگتے ہوئے آہستہ سے کہا کہ ''تم نے جو دلی سے کناڈا تک کا واپسی کا ٹکٹ لیا ہے وہ صرف تین مہینے تک valid رہے گا پھر کینسل ہو جائے گا'' میں نے اور آہستہ سے کہا۔

''وہ واپسی کا ٹکٹ تم یہیں ابھی پھاڑ کر پھینک دو تو اچھا ہے۔''

☆☆

رین چیک

اوپر اشنا کے کمرے میں اسٹریو پوری آواز سے بج رہا تھا۔ گھر میں داخل ہوتے ہی میرا موڈ خراب ہوگیا۔ میڈونا کی آواز سارے گھر میں گونج رہی تھی وہی منحوس گانا۔

" Papa don't Preach"

عامر اوپر اپنے کمرے میں نہ جانے کیا کر رہا تھا بالکل ایسا لگ رہا تھا کہ گھر میں بھونچال آیا ہوا ہے۔ ایک تو کناڈا کے گھر بھی کیا ہیں، اندر سے لکڑی کے کھوکھے اور اوپر سے چکنے چمکدار۔ کوئی اوپر کے کمروں میں زور سے چلے بھی تو لگتا ہے کہ اوپر گھڑ دوڑ ہو رہی ہے... موسم کی وجہ سے بھی میرا موڈ خراب تھا۔ باہر سردی ہے کہ توبہ! رات بھر جو برف گری تھی اب شیشے کی طرح چکنی ہوگئی تھی، چلنا بھی مشکل اور گاڑی چلانا بھی مشکل۔ میں نے کمرے میں نظر ڈالی تو جی ہی جل گیا۔ سیٹر ڈے کا دبیز اخبار آیا تھا اور اس کے سارے صفحے اِدھر اُدھر بکھرے تھے۔ کافی کی جھوٹی پیالیاں اور کشن بھی بے ترتیب پڑے تھے۔ میں حسب عادت خود بخود بڑبڑانے لگی۔ سوائے بڑبڑانے کے اور کر بھی کیا سکتی ہوں۔

''ہاں! ہاں! معلوم ہے نا، کہ ابھی وہ نوکرانی بازار سے خریداری کر کے آئے گی۔ جھک مار کر خود کرلے گی صفائی ...نوکرانی ہی تو میں ہوں اس گھر میں ...بلکہ مہترانی بھی، ڈرائیور بھی... باورچی بھی...''۔

اتنے میں زینے پر اک زلزلہ سا آیا اور اشنا طوفانی انداز سے زینے سے اتر کر چلاتی ہوئی آرہی تھی۔ ایکسر سائز کے چست لباس میں اسے دیکھ کر میرا دل اور جلا، وہ چیخ رہی تھی۔

''آپ نے اتنی دیر کردی۔ آپ کو معلوم تھا نا! مجھے گیارہ بجے Y.W.C.A جانا تھا

ایکسر سائز کی کلاس کے لئے۔ سینڈی میرا وہاں انتظار کر رہی ہوگی۔ آپ گاڑی لے گئیں۔ کہا تھا آپ نے دس بجے آنے کو، اب دیکھئے گھڑی ساڑھے گیارہ بج چکے۔ مجھے دیر ہوگئی"۔

میں نے بہت ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔

"چلو ایکسر سائز کی کلاس تو وہاں ہر گھنٹے بعد ہوتی ہے، اب چلی جاؤ... اصل میں مجھے آج کئی کام کرنا تھے۔ ہفتے بھر کی گروسری کی شاپنگ میں وقت تو لگتا ہی ہے نا!"

اشنا بالکل آپے سے باہر ہوگئی۔

"اور وہاں میری دوست سینڈی میرا ویٹ کر رہی تھی۔ آپ کے لئے تو کچھ نہیں ہوا میرا پروگرام تو اپ سیٹ ہوگیا۔

"You have no sense of responsibility"

میں بھی اب پھٹ پڑی۔

"ہاں! ہاں! مجھے کوئی احساس ذمہ داری نہیں ہے۔ تفریح کرنے گئی تھی نا!... نوکر نہیں ہوں تم سب کی... کھانا پکاؤں، صفائی کروں، گھر کا سودا سلف لاؤں اور پھر اگر وہ تمہاری چہیتی دوست سینڈی تمہارے بغیر ایکسر سائز کر لے گی تو کون سی قیامت آ جائے گی۔"

اشنا نے زور سے پیر پٹخا۔

" You are impossible Mom"

میں آج خود کو قابو میں نہیں رکھ پا رہی تھی۔

" بکواس بند کرو! اور تم سے کہا تھا نا میں نے، آج چھٹی کے دن ذرا ویکیوم کر لینا گھر میں، صفائی کر لینا، مگر تمہیں ہوش کہاں... فرصت ملے نا دوستوں کو ٹیلی فون کرنے سے... اور بند کرو یہ منحوس اسٹریو۔ نفرت ہے مجھے اس گانے سے اور گانے والی سے... کیا گانا ہے! صاحبزادی فرما رہی ہیں باپ سے کہ میں کنواری ماں بننے والی ہوں پاپا مجھے نصیحت مت کرو... ہاں! ہاں! نصیحت نہ کریں تو کیا سر پر بٹھائیں کہ واہ! واہ! پیاری بیٹی بڑا نام روشن کیا ہے تم نے ہمارا"۔

مجھے اپنے لہجے اور الفاظ پر خود بھی حیرت ہو رہی تھی... یہ میں ہوں رعنا رحمٰن، جو اپنے دھیمے مزاج اور مدھم لہجے کے لئے مشہور تھی۔

اشنا دھڑام سے دوراز ہ بند کر کے نکل گئی۔ جاتے جاتے اس کا یہ جملہ میرے کانوں

میں اور دل میں چھید کر گیا۔

"Frustarted Woman! makes every one's life miserable"

وہ اوپر گئی اور اپنا پرس اور کوٹ لے کر واپس آئی اور گاڑی کی چابی میرے سامنے سے اٹھا کر جانے لگی، میں نے کہا۔

''اب گاڑی لے جا رہی ہو تو جلدی آنا شام کو مسز صدیقی کے گھر کھانے پر جانا ہے۔ شاید ابو کی گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے''۔

اشنا نے میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''مجھے کہیں نہیں جانا ہے، کسی بھی بورنگ جگہ... کیا ہوتا ہے وہاں... ابو اور دوسرے سارے آدمی لوگ ایک کمرے میں بیٹھ کر انڈیا اور پاکستان کی پالیٹکس ڈسکس کریں گے، بحث کریں گے، کمرے میں بیٹھ کر اسلامک ریولوشن لائیں گے اور کوئی کسی کی بات نہیں سنے گا۔ اور لیڈیز دوسرے کمرے میں جمع ہو کر کھانے اور کپڑوں کی باتیں کریں گی... یا وہ مسز پاشا اپنی Preaching شروع کر دیں گی کہ نیل پالش لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، اس ڈبل روٹی میں لارڈ ہے، یہ ہے وہ ہے... ان سے پوچھئے گا کہ یونیورسٹی میں ان کی بیٹی کیا کرتی پھرتی ہے... سب کے سب Hypocrates''۔

ایک بار پھر زور سے دروازہ بند کر کے اشنا باہر نکل گئی۔ میرا دل چاہا کہ پکڑ کر دو چانٹے رسید کروں اس کے منہ پر لیکن مجھے کیا گھر میں آفت بلانی تھی۔ تین برس ہوئے جب اشنا چودہ برس کی تھی کی تو ایسی ہی کسی بدتمیزی پر ارشد نے بیٹی کو ایک چانٹا مار دیا تھا... آفت ہی تو آ گئی تھی گھر میں۔ اشنا کے اسکول کی کاؤنسلر اور سوشل ورکر نے مجھے اور ارشد کو بلا بھیجا تھا یہ بتانے کے لئے کہ یہ Child Abuse ہے، یہ ہے، وہ ہے، اس کے بعد سے ارشد نے تو بیٹی کے تئیں خود کو خول میں بند کر لیا تھا۔

لیکن اس وقت بات تو اشنا دل کو لگتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ دل میرا بھی گھبراتا ہے ان بورنگ دعوتوں سے... مگر کریں بھی کیا اس اجاڑ چھوٹے سے شہر میں، چودہ سال ہو گئے ہمیں یہاں آئے ہوئے۔ بس لے دے کے وہی بیس پچیس ہندوستانی اور پاکستانی خاندان، بس ایک دوسرے کے گھر کھانے کی دعوتیں ہو گئیں بہت ہوا تو شاپنگ مال چلے گئے... اور اب تو شاپنگ

سے بھی نفرت ہوگئی ہے۔...آج ہی کی بات لے لو، پورا پون گھنٹہ لگا مجھے اک اسٹور میں وہاں آدھے دام پر Vacuame کلینز سیل پر لگا تھا، لگتا تھا کہ سارے شہر کو ویکیوم کلینز کی ضرورت پڑ گئی تھی خلقت ٹوٹی ہوئی تھی۔ جب تک میں شیلف تک پہنچوں مال ختم ہوگیا اس لئے منیجر کے پاس جا کر کہنا پڑا تب اسنے رین چیک دیا...اب یہ رین چیک کی سلپ دکھا کر اگلے ہفتے یا جب بھی نیا مال آئے گا مجھے ویکیوم کلینز سیل کی آدھی قیمت پر مل جائے گا۔...کیا خوب اصطلاح نکالی ہے ان امریکنوں نے...رین چیک، لیکن سارا دن غارت ہوگیا آج میرا اس کے پیچھے۔ گھر آئی تو صاحبزادی کی بدتمیزی اور بدمزاجی...میرا دل چاہ رہا تھا کہ کسی پر چیخوں، غصہ کروں...مگر کس پر؟...اس گھر میں ہر ایک کو غصہ کرنے کا اور موڈ خراب کرنے کا حق ہے سوائے میرے۔

چھٹی کے دن میرا کام اور بڑھ جاتا ہے۔ شکایت کرو تو میاں پھٹ سے کہہ دیتے ہیں کہ نوکری چھوڑ دو۔ صرف گھر سے باہر کچھ کرنے کیلئے میں نے ایک ڈاکٹر کے کلینک میں receptionist کی جاب لے لی تھی ویسے یہ کوئی بہت اکسائیٹنگ جاب تو نہیں تھی بس ذرا کچھ مختلف قسم کے لوگوں سے ہی ملاقات ہو جاتی تھی۔ اسی بہانے صبح تیار ہو کر گھر سے باہر تو نکل جاتی ہوں۔

مجھے پھر اشنا کا آخری جملہ ڈسنے لگا...فرسٹیٹڈ عورت... ہاں اب تو میں صرف ایک فرسٹیٹڈ عورت ہی رہ گئی ہوں۔ میری فرسٹ کلاس سوشیالوجی کی ڈگری کسی کونے میں پڑی ہوگی، اور یونیورسٹی میں پائے ہوئے سارے مباحثوں اور ڈراموں کے سارٹیفکٹس تو شاید اب ڈھونڈے سے بھی نہ ملیں...خود کو تو جیسے اب میں بھول ہی گئی ہوں...سر درد سے پھٹا جارہا تھا میں نے اپنا سر دباتے ہوئے آنکھیں بند کر لیں۔ مجھے خبر بھی نہیں ہوئی اور میرے سر کے نیچے رکھا ہوا صوفے کا کشن میرے آنسوں سے بھیگ گیا۔

''آپ روئیں نہیں mom آپ لوگ اشنا کا سمجھنے کا کوشش کریں'' میرے بیٹے عامر نے دھیرے سے میرے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ وہ کب میرے صوفے کے قریب آ کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کے جملے پر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی میں نے کہا۔

''بیٹے سمجھنے کا کوشش نہیں، سمجھنے کی کوشش''۔

اشنا کی اُردو اچھی تھی کیوں کی وہ چار سال کی عمر میں ہندوستان سے کناڈا آئی تھی۔ عامر تب صرف سال بھر کا تھا اس لئے اس کی اردو بہت مضحکہ خیز ہوتی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''امی! میں فرینک کے ساتھ شام کو جاؤں گا فلم کے لئے''۔

''اور مسز صدیقی کے گھر دعوت میں؟'' میں نے اُٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''Come on Mom!، میں وہاں جا کر کیا کروں گا، آپ کو تو پتہ ہے...''

عامر نے کہا اور میرے گال پر پیار کر کے چلتا بنا۔

میں مسکرا دی... شیطان کہیں کا... میرا بیٹا کتنا لمبا ہو گیا ہے اور باتیں بھی کتنی سمجھداری کی کرتا ہے۔ اشنا جب تیرہ چودہ سال کی ہوئی تھی تب ہی تو ہمارے گھر کا سکون غارت ہو گیا تھا... ہر ہر بات پر بحث، ہر بات پر ہنگامہ... میں سوئمنگ کاسٹیوم پہن کر سوئمنگ کیوں نہیں کر سکتی، اسکرٹ اور شارٹس پہننے پر ابو کو کیا اعتراض ہے۔ اپنی دوستوں کے گھر رات کو سلمبر پارٹی میں کیوں نہیں جا سکتی... دوسری دوستوں کی طرح ڈیٹ پر کیوں نہیں جا سکتی۔ کیوں ہر وقت چڑ چڑا پن اور بد مزاجی سوار رہتی تھی اس کے اوپر۔ مستقل بس دوستوں سے فون پر باتیں کرتی رہتی تھی۔ پڑھائی کی طرف بھی زیادہ توجہ نہیں دیتی تھی... کیسے کیسے بے تکے کپڑے پہنتی تھی عجیب حلیئے بنا کر گھوما کرتی تھی۔

ایک بار جب وہ کسی بات پر غصّے میں بہت بدزبانی کر رہی تھی تو ارشد نے ایک چانٹا مار دیا تھا بس پھر تو طوفان آ گیا تھا۔ اسکول کی کاؤنسلر نے نہ جانے اشنا کو کیا سمجھایا کہ بات اور بگڑ گئی۔ اشنا نے اس سے اپنے سارے دکھڑے کہے ہوں گے۔ پھر ایک سوشل ورکر ہمارے گھر تشریف لائیں تھیں ہمارے اور ہماری بیٹی کے درمیان ایک معاہدہ کرانے کے لئے... انھوں نے ہمیں بتایا کی اس ملک میں ہمیں اپنی اولاد کو کیسے پالنا چاہیے، سوشل ورکر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کسی لڑکے کے ساتھ اشنا کے ڈیٹ پر جانے سے کیا ہمیں کیا اعتراض ہے۔ سوشل ورکر نے ہمیں سمجھایا کہ ہمیں اشنا کے ساتھ کیا کیا کرنا ہے اور کیا کیا نہیں کرنا ہے۔

اور آج تک گویا ہم اسی معاہدے کے تحت جی رہے ہیں۔ ارشد نے تو خود کو مصروفیت کے خول میں بند کر لیا ہے... وہ ہیں اور ان کے آفس کا کام اور کمیونٹی کی مسجد کے کاروبار... اب بس میں رہ گئی بیٹی سے نبٹنے کے لئے... پھر جب پچھلے سال اشنا کا اسکول ختم ہوا اور کالج میں داخلے کی بات ہوئی تو ایک اور ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ اس کی ضد تھی کہ میں ٹورانٹو کی یونیورسٹی میں پڑھوں گی... مجھے خوب معلوم تھا کہ بس گھر سے دور رہنے کا بہانہ تھا اور جب اسے یہیں اسی شہر میں یونیورسٹی میں داخلہ لینا پڑا تو تب سے شدید موڈ آف ہے... کیا کروں اس لڑکی کا... کہاں چلی گئی

میری وہ پیاری سی گڑیا جسے میں اپنے ہاتھ سے خوبصورت فراکیں سی کر پہناتی تھی، بالکل پری بنا کر رکھتی تھی، کتنی جان دی تھی میں نے اس پر، بچپن میں ہر ضد پوری کی تھی۔

صوفے پر لیٹے لیٹے تھوڑی دیر کیلئے میری آنکھ جھپک گئی۔ میں نے اُٹھ کر نماز پڑھی اور مسز صدیقی کے گھر جانے کیلئے تیار ہونے لگی۔ اثنا کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں تھا۔ شکر ہے کہ ارشد کی گاڑی اسٹارٹ ہوگئی۔ مسز صدیقی کے گھر سے دعوت کے دوران میں نے ایک دو بار اپنے گھر فون کیا مگر فون انگیج ہی ملا، میں سمجھ گئی کہ اثنا یا عامر فون پر مستقل اپنے دوستوں سے باتیں کر رہے ہوں گے۔ رات کو ایک بجے جب ہم دعوت سے لوٹے تو دونوں اپنے اپنے کمروں میں سوئے ہوئے تھے۔

دوسرے دن اتوار تھا تو میں بھی صبح دس بجے سو کر اٹھی تو دیکھا کہ عامر تو صبح صبح اپنے کسی دوست کے ساتھ فون پر skiing کا پروگرام بنا رہا ہے۔ اثنا کچن میں بیٹھی کارن فلیکس کھا رہی تھی، مجھے آتا دیکھ کر اپنا پیالہ اٹھا کر اوپر اپنے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے باہر نظر ڈالی تازہ گری ہوئی برف دھنکی ہوئی روئی کے ڈھیر جیسی لگ رہی تھی۔ میں چائے بنا کر فریدہ خانم کی گائی ہوئی غزلوں کا کیسٹ لگا کر سکون سے پینے بیٹھی ہی تھی کہ ارشد تیار ہو کر نیچے اترتے ہوئے بولے۔

”ارے! تم تو آرام سے بیٹھی غزلیں سن رہی ہو، تیار نہیں ہونا، آج مسجد میں پرویز شیخ نے قرآن خوانی کرائی ہے ان کے والد کا لاہور میں انتقال ہوگیا ہے۔ بارہ بجے سے پہلے پہنچنا ہے۔“

”چلو آج اتوار کا دن بھی گیا“۔ میں حسب عادت بڑبڑانے لگی۔

جب میں تیار ہو کر آئی تو ارشد باہر اپنی گاڑی اسٹارٹ کرنے کی کوشش کر رہے تھے مگر وہ اسٹارٹ ہی نہیں ہوئی تو مجبوراً دوسری گاڑی لینی پڑی جو میں اور اثنا استعمال کرتے تھے۔ جب میں گاڑی میں بیٹھنے لگی تو اثنا کا چھوٹا سا پرس سیٹ پر پڑا تھا جس میں وہ اپنا کنگھا اور لپ اسٹک وغیرہ رکھتی تھی وہ پرس اٹھا کر جب میں کار کے gloves comparment میں رکھنے لگی تو اس میں سے ایک چھوٹا سا پیکٹ نکل کر میرے پاؤں کے پاس گر گیا.... اس سے پہلے کہ ارشد کی نظر اس پر پڑے میں نے اپنا برف والا بھاری بوٹ رکھ دیا اور پھر مسجد پہنچ کر گاڑی سے اترتے وقت وہ پیکٹ چپکے سے اپنے پرس میں ڈال لیا۔ مسجد میں سیپارے پڑھتے وقت وہ پیکٹ بچھو کی طرح میرے ذہن میں ڈنک مارتا رہا۔ جیسے تیسے گھر آئی... شکر ہے ارشد نیچے لونگ روم میں بیٹھ کر ہاکی کا میچ دیکھنے لگے۔ اثنا کے کمرے کے سامنے سے گذری تو دیکھا کہ وہ بیڈ پر اوندھی لیٹی کسی سے

فون پر بات کر رہی تھی۔ میرے کان میں بس یہ جملہ پڑا۔ اشنا کہہ رہی تھی۔

" Oh! He is so cool, so Cute"

میں اپنے کمرے میں جا کر بیڈ پر گر پڑی... دماغ پھٹا جا رہا تھا... سرہانے رکھا فون بار بار اکسا رہا تھا... اٹھا لو فون اور معلوم لو کہ وہ کون کم بخت Cool لڑکا ہے جو بہت کیوٹ ہے... شاید مائک ہو... جارج یا پھر شاید راجیش؟... لیکن اگر اشنا کو پتہ چل گیا کہ میں اس کا فون سن رہی ہوں تو قیامت آ جائے گی... اونہہ... مجھے اب کسی چیز کی پرواہ نہیں اب رہ ہی کیا گیا ہے...

اور میں نے دھیرے سے سرہانے رکھا ریسیور اٹھا لیا... اشنا اپنی دوست مدیحہ سے باتیں کر رہی تھی۔

"کل بہت مزہ آیا، پہلے میں اور مائک یوں ہی گھومتے رہے... پتہ ہے کل میں نے بیئر آرڈر کر دی... چھی چھی اتنی بدمزہ تھی... مائک اتنا کیوٹ ہے، میرے سامنے سے اٹھا کر بیئر خود پی گیا اور میرے لئے سیون اپ منگا دیا... کل مجھے اتنا غصہ آ رہا تھا... کل ہم دونوں نے لمباڈا (lambada) ڈانس کیا، گیارہ بجے تک ڈانس کرتے رہے... you know ملیحہ... کل میرا موڈ اتنا خراب تھا... میں کچھ بھی کر سکتی تھی My mom is driving me crazy... میں اتنے غصے میں تھی کہ... مگر مائک اتنا ڈیسنٹ اور کیوٹ ہے... ڈانس کے بعد مجھے گھر چھوڑ گیا He behaved like a perfect Gentleman اور پتہ ہے جاتے جاتے کیا بولا... کہنے لگا

I did not want to take advantage of your bad mood today but I am taking a rain check... بدمعاش کہیں کا...

میں نے دھیرے سے فون رکھ دیا۔ دماغ بالکل خالی تھا... نہ جانے کیوں... میں تھوڑی دیر آنکھیں بند کر کے لیٹی رہی۔ اشنا فون پر بات ختم کر کے شاید کچھ کھانے کے لئے نیچے کچن میں گئی تو میں اس کے کمرے میں گئی اور وہ پیکٹ اس سائیڈ ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا جس پر اشنا کے بچپن کی تصویر فریم میں مسکرا رہی تھی۔ کمرے سے نکلتے وقت میں اس کی الماری میں سے وہ گڑیا بھی اٹھا لائی جو میری امی نے اشنا کی پانچویں سالگرہ پر اپنے ہاتھ سے بنا کر بھجوائی تھی۔ لال غرارے اور گوٹا لگے لال دوپٹے میں ملبوس دلہن بنی گڑیا میں نے لا کر اپنی الماری میں چھپا دی۔

☆☆

ہُنڈی

جعفری صاحب نے ہینڈ پمپ سے پانی کی بالٹی بھری اور اپنے گھر کے سامنے کے مختصر باغیچے کی آخری کیاری بھی تر کردی۔ گلاب کے پودوں کی جڑ میں چائے کی کیتلی میں بچی ہوئی پتی انڈیلی، ٹماٹر کے پودوں میں پتلی پتلی کھپچیاں سہارے کے لئے باندھیں، پھر نیم کے درخت کے نیچے رکھے ہوئے مونڈھے پر آ بیٹھے جہاں وہ حقہ تیار کر کے پہلے ہی رکھ گئے تھے۔ دوسرا مونڈھا ابھی رفیق صاحب آ کر آباد کریں گے۔

عین ساڑھے آٹھ بجے رفیق صاحب ریٹائرڈ انکم ٹیکس آفیسر چھڑی لئے نمودار ہوئے لکڑی کا خستہ حال پھاٹک چر چرایا۔ رفیق صاحب نے وہیں سے آواز لگائی۔

''آداب عرض! ارے جناب جعفری صاجب، اب یہ پھاٹک جواب دے گیا ہے اسے بدل ہی ڈالئے''

جعفری صاحب حقہ گڑگڑاتے ہوئے بولے۔

''اب تو بہت کچھ جواب دے گیا ہے۔''

''آپ کے لان کی گھاس پر شادابی نہیں ہے''۔ رفیق صاحب نے باغیچے پر نظر ڈالی۔

''جب سارے محلے والے میونسپلٹی کی پائپ لائن میں ٹلو پمپ لگا کر اپنے دو دو تین منزلہ مکانوں کی پانی کی ٹنکیاں بھرلیں گے تو ہماری قسمت میں ہری گھاس کیسے آئے گی۔ وہ تو میں صبح ہی گھر کی بالٹیاں وغیرہ بھر کے رکھ لیتا ہوں ورنہ پینے کے لئے بھی پانی نہ نصیب ہو۔ ہمارا باغیچہ تو بے چارہ ہینڈ پمپ کے سہارے ہی زندہ ہے''۔ جعفری صاحب نے کہا۔

''ارے تو آپ بھی لگوا لیں نا اک ایسا ہی پمپ، پانچ سو روپئے کی بات تو ہے''۔ رفیق

صاحب نے مشورہ دیا۔

''جی ہاں! تا کہ پیچھے کوٹھری میں رہنے والے رکشہ والے بشیر کے خاندان کو پانی کا اک قطرہ بھی نہ ملے اس کے پاس تو ہینڈ پمپ بھی نہیں ہے اور پھر یہ پمپ غیر قانونی ہیں''۔ جعفری صاحب نے مختصر سا جواب دیا۔

رفیق صاحب نے بات بدلنے میں ہی عافیت سمجھی۔''اب دیکھئے نئے الیکشن کیا رنگ دکھاتے ہیں''۔

رفیق صاحب خود بھی ٹلو پمپ کے ذریعے اپنے گھر کے لئے اور اپنے چار کرائے داروں کے لئے پانی مہیا کرتے تھے۔

پھاٹک پھر چرچرایا اور سائیکل اک ہاتھ میں تھامے دوسرے ہاتھ میں کاغذوں کا پلندہ لئے اک چپراسی نما آدمی اندر آیا تھا۔

''آپ کا بجلی کا بل ہے''۔وہ کاغذ تھما کر چل دیا۔

جعفری صاحب نے کہا''اوہو بڑے سویرے سویرے آج سرکاری کام ہو رہا ہے... کمال ہے اتنا کم بل ہے دو مہینے کا... صرف 350 روپئے... ارے بھائی! ذرا رکنا... ارے بجلی والے... یہ تو شمیم صاحب کا بل دے گئے تم ہمیں''۔ بجلی والا دوسرا بل دے کر روانہ ہو گیا۔

''ہاں یہ تو ہمارا ہی بل ہے۔یقینی طور پر... 1150 روپئے کا ہمارا ہی ہوگا۔سمجھ میں نہیں آتا پڑوس میں شمیم صاحب کے یہاں کیا معاملہ ہے، تین تین کولر چلتے ہیں دن بھر۔ہیٹر پر کھانا بھی پکتا ہے ٹیوب ویل بھی چلتا ہے اور ان کا بل صرف تین سو پچاس روپئے... عجیب بات ہے۔'' جعفری صاحب نے حقے کی چلم پر پھونک مار کر راکھ اُڑاتے ہوئے کہا۔

ان کا چھوٹا بیٹا جو ابھی سو کر اٹھا تھا، ہاتھ میں چائے کا مگ لئے باہر آ کر گھاس پر بیٹھا اخبار دیکھ رہا تھا، بغیر اخبار سے سر اٹھائے بولا۔

''عجیب بات یوں ہے کہ شمیم صاحب کے بیٹے نے بجلی کے میٹر میں کچھ کاریگری کر لی ہے لہذا اس میں ریڈنگ ہی نہیں آتی''۔

جعفری صاحب نے حقے کا ایک لمبا کش لیا، نظر اٹھا کر دیکھا، شمیم صاحب کے گھر کے باہری برآمدے اور پورٹیکو میں بلب اب بھی جل رہے تھے۔وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔

''کیوں بھئی آج اتنی جلدی بیٹھک ختم'' رفیق صاحب نے پوچھا۔

''آج پھر ٹیلی فون کے دفتر جانا ہے۔وہ جوان خبیثوں نے میرے نام پر 8000 روپئے کا بل بھیج دیا تھانا۔مہینے ہو گئے اسی کا چکر ہے، نہ جانے کہاں کہاں کی امریکہ اور دبئی وغیرہ کی کالیں ہمارے ٹیلی فون نمبر پر لگادیں۔اور اب فون کاٹ دیا ہے کہ جب تک بل نہیں دیں گے فون نہیں ملے گا... بھلا بتایئے میں کیوں دوں یہ پیسے...اور دوں بھی تو کہاں سے ...وہ تو کہیے جب میں ہیڈ ماسٹر تھا تب یہ فون مل بھی گیا تھا مجھے اب تو ملنا بھی ناممکن ہے۔'' حیدر سر جھکائے اخبار پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولا۔

''بے کار ہے ٹیلی فون کے دفتر کے چکر لگانا، یہ پیسہ تو آپ کو بھرنا ہی ہوگا۔ورنہ آپ کہیے تو میں آج ہی تار جوڑ دوں،فون ریسیور تو ہو ہی سکتا ہے...مگر آپ مانیں گے نہیں''۔

جعفری صاحب نے جواب نہیں دیا اور خاموشی سے اپنا مونڈھا اٹھا کر باہری برآمدے میں رکھدیا اور گھر کے اندر چلے گئے۔

وہ تیار ہو کر ٹیلی فون کے دفتر جانے کے لئے گھر کے پھاٹک سے نکلے ہی تھے کہ اور سیئر نجیب کی نئی ماروتی کار ان کی کھدر کی شیروانی پر کیچڑ کی گلکاری کرتی چلی گئی۔سامنے والے خالی پلاٹ میں بھی شاید مکان بننے لگا تھا، اینٹوں کا ٹرک تقریباً آدھی سڑک گھیرے ہوئے تھا باقی سڑک پر دو کاریں اور ایک موٹر سائیکل آڑی کھڑی تھیں اور ان سب کے درمیان سے بھینسوں کا ایک ریوڑ خراماں خراماں گذر رہا تھا۔مجبوراً انہیں دوسری طرف والی سڑک سے ہی جانا پڑا جہاں کوڑے کا ڈھیر روز بروز بڑھتا جارہا تھا۔احمد نگر کو لوگ اب ڈالر کالونی کہنے لگے تھے بیرونی ممالک سے کمائے گئے زر مبادلہ سے بنوائی ہوئی نئی کوٹھیاں اور مکانات بڑھتے ہی جارہے تھے اور ساتھ ساتھ ہر کوٹھی کے پہلو میں کوڑے کے ڈھیر بھی نمودار ہوتے رہتے تھے۔

''انواع واقسام کا دیسی اور ولایتی کوڑا''۔

جعفری صاحب نے سوچا۔

کوڑے، کھلی گندی نالیوں اور اسکوٹر اور کاروں سے بچتے بچاتے جب وہ چوراہے پر پہنچے تو موٹے لالہ کی دکان کے سامنے میونسپلٹی کے پانی کا نل اسی طرح بھل بھل بہہ رہا تھا جیسے پرسوں بہہ رہا تھا۔جعفری صاحب نے محلے کے میونسپل کمیٹی کے نمائندے سے یاددہانی کرائی تھی

مگر وہ اپنی ٹھیکیداری میں اتنا مشغول تھا کہ ان باتوں کے لئے فرصت ہی نہیں تھی۔ وہ پھر بھی خاموش نہ رہ سکے۔ انھوں نے پنساری کی دوکان والے لالہ کرن سنگھ سے کہا۔

''ارے لالہ جی کچھ کیجئے نا اس نل کا، کتنا پانی ضائع ہوتا ہے''۔

لالہ جی نے گاہک کو سودا تھماتے ہوئے کہا۔

''صاحب یہ تو میونسپلٹی والوں کا کام ہے ہم کیا کر سکتے ہیں''۔

''اب دیکھئے جعفری صاحب ہمارے گھر کے پیچھے تین دن سے ایک بلّی مری پڑی ہے بدبو کے مارے کھڑکی نہیں کھول سکتے۔ کوئی کچھ کرتا ہی نہیں''۔ کالج کے استاد محمد احمد صاحب بھی وہیں کھڑے تھے وہ بولے۔

جعفری صاحب نے کہا۔

''میں نے تو پہلے بھی کہا تھا کہ محلہ کمیٹی بنایئے، Petition کیجئے، شکایت کیجئے کچھ تو انتظام ہو اس غلاظت کا''۔

''ارے صاحب کہیں کچھ ہوتا ہوا تا نہیں ان سب باتوں سے'' محمد احمد بولے۔

''تو پھر سونگھتے رہیئے وہ مری ہوئی سڑی بلّی یا ہو سکے تو خود گڈھا کھود کر دبا دیجئے اسے''۔ جعفری صاحب کہتے ہوئے آگے بڑھ گئے۔

آج کوئی رکشہ والا کٹھ پلے کے اس پار شہر جانے پر راضی ہی نہیں ہو رہا تھا۔ مشتاق پان والے نے آواز دی۔

''کہاں جا رہے ہیں، آج شہر میں بہت ٹینشن ہے جمعہ کی نماز کے بعد سنا ہے ادھر سے کوئی جلوس نکلے گا۔ بڑی پولیس لگی ہے''۔

''ارے نہیں میاں! یہ سب خواہ مخواہ دہشت پھیلانے کے افواہیں ہیں'' وہ بولے۔

''جعفری صاحب! جب فساد ہوتا ہے نا! تو بلوائی یہ نہیں پوچھتے کہ کانگریسی ہو یا لیگی۔ آپ کے کھدر کے کپڑے بھی نہیں بچائیں گے آپ کو۔ کہاں جا رہے ہیں''۔ اسٹیشنری والے رحمت علی ہاتھ چلا کر بولے۔

''میاں ہمیں کیا ڈراتے ہو سن سینتالیس میں شانتی سینا والوں کے ساتھ ہم تو ایسے ایسے فساد زدہ علاقوں میں جاتے تھے کہ تم تو تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اور پھر ہمیں تو یقین ہے جس کی

جہاں آئی ہے جیسی لکھی ہے وہیں موت ہوگی''۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے بولے۔ انھوں نے اب پیدل ہی ٹیلی فون کے دفتر جانے کی ٹھان لی تھی۔

گرلز کالج کے پاس ان کا ایک پرانا طالب علم مل گیا اسنے انھیں اپنی موٹر سائیکل پر بٹھا کر دفتر پہنچا دیا حالانکہ وہ منع کرتے رہے۔ ٹیلی فون کے دفتر میں ایک میز سے دوسری میز، ایک بابو سے دوسرے بابو کا چکر لگاتے لگاتے ایک بج گیا۔ اور ہاتھ آئے تو بس کچھ ایسے ہی جملے۔

''بابو جی چھٹی پر ہیں''۔

''مشرا صاحب؟...آئے تو تھے..یہیں کہیں ہوں گے''۔

''صاحب ہم کچھ نہیں کر سکتے اوپر اپروچ کیجئے''۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے لکھ دیں منسٹر کو ہمیں کیا غصہ دکھا رہے ہیں، دلی جا کر دیجئے اپنا بھاشن''۔

واپسی میں ان جملوں کی کوفت اور دھوپ نے سر چکرا دیا مگر شکر ہے کہ واپسی میں رکشہ مل گیا۔ ان کے گھر کے قریب موڑ پر تین چار اسکول کے لڑکے ڈھیلے مار مار کر کھمبے کا بلب توڑنے کا مقابلہ کر رہے تھے انہیں دیکھ کر لڑکے ادھر ادھر ہو گئے۔ ان میں سے ایک بولا۔

''یار پھوٹ لو! ورنہ بھاشن دیں گے''۔

دوپہر کو کھانے کی میز پر گئے تو کمرہ کچھ بدلا بدلا لگا۔ غور کیا تو دیکھا کہ دیوار سے گاندھی جی نہرو اور مولانا آزاد کی تصویریں غائب تھیں اور ان کی جگہ کچھ تجریدی پینٹنگس کے ری پرنٹ سجا دئے گئے تھے۔ وہ سمجھ گئے کہ یہ ان کے بڑے بیٹے ضیاء کا کارنامہ ہے وہ آج کل لکھنؤ سے چھٹی پر آیا ہوا تھا وہاں C.D.R.I میں سینئر سائنٹسٹ تھا۔ جعفری صاحب نہ کچھ کہا نہیں لیکن ضیا خود ہی بول اٹھا۔

''لیڈروں کی تصویریں ڈرائنگ میں لگانا بہت ''بابو پن'' لگتا ہے ٹچا سا...وہ تصویریں میں نے برآمدے میں لگا دی ہیں''۔

حیدر دھڑ سے دروازہ کھول کر اندر آیا۔

''میرا سعودی عرب کا ویزا آ گیا ہے''

''کتنے لئے ایجنٹ نے؟'' ضیاء نے پوچھا۔

''بیس ہزار... پندرہ آپ نے اپنے پراوڈنٹ منڈ سے نکلوا کردیئے تھے، پانچ کا انتظام میں نے کرلیا تھا... بس اب جہاز کی سیٹ مل جائے جلدی سے'' حیدر بہت خوش تھا۔

''ٹھیک ہے تم جاؤ ضرور۔ مگر بھئی ہم نے تو زندگی کا اک مقصد بنایا تھا..''

حیدر نے جعفری صاحب کی بات کاٹ دی۔

''جی ہاں! آپ نے مقصد بنایا تھا کہ ملک وقوم کی خدمت...زندگی بھر ایمان داری سے بچوں کو پڑھایا اسکول میں اور اب پیدل ٹیلی فون کے دفتر کے چکر لگاتے ہیں ...واہ واہ ... بھارت ماتا زندہ باد... یہ سب Cliche ہیں''۔

ضیاء نے اپنے مخصوص مسخرے انداز میں بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ہیئر ہیئر ...آپ سے ملیئے ہندوستان کی نئی نسل کی معراج نئے N.R.I حیدر جعفری... یار حیدر مگر تم سعودی عرب سے سفید سوٹ اور سفید جوتے پہن کر نہ آنا خدا کے لئے''۔

حیدر سنجیدگی سے بولا۔

''یہ N.R.I کم سے کم ہُنڈی سے پیسہ تو نہیں بھیجے گا''۔

جعفری نے سر اٹھا کر پوچھا

''یہ ہُنڈی کیا ہوتی ہے؟''

''ارے آپ کو ہُنڈی بھی نہیں معلوم''۔ حیدر نے حیران ہو کر کہا۔

☆☆

بے خانماں

اس ڈے کیئر سینٹر میں طرح طرح کے بچے آتے تھے، ہر ملک کے، ہر رنگ کے، ہر وضع کے بچوں سے واسطہ رہتا تھا۔ کناڈا ملک ہی ایسا ہے، رنگا رنگ پس منظر کے، مختلف ممالک سے آکر بسے ہوئے پناہ گزیں، مہاجر ہر طرف نظر آتے ہیں۔ مانٹریال میں برسوں سے رہتے ہوئے اور یہ ڈے کیئر سینٹر چلاتے ہوئے اب مجھے اتنا تجربہ ہو گیا ہے کہ شکل دیکھ کر اندازہ لگا لیتی ہوں کہ یہ شخص کس ملک سے آیا ہوا ہے اور پھر رہی سہی کسر نام پورے کر دیتے ہیں۔

آج جب وہ اپنے بچے کے ساتھ میرے ساتھ آفس میں آئی تو میں نے اندازہ لگایا کہ وہ یا تو مصری ہے یا ایرانی۔ اور جب اس نے اپنا نام بتایا تو یقین آ گیا کہ وہ ایرانی ہی ہے۔ شہرزادے اپنے چار سالہ بچے آذر نوش کو ڈے کیئر سینٹر میں داخل کرنے آئی تھی۔ جب میں نے اپنی فارسی دانی کی دھاک بٹھانے کے لئے کہا ''حالِ شما چہ طور ے'' تو وہ بہت خوش ہوئی۔ اس کی انگریزی بس واجبی سی تھی۔ میں نے عورتوں کی فطری سراغ رسانی سے کام لیتے ہوئے گفتگو کے دوران شہرزادے کا پورا جائزہ لے لیا۔ لمبے اسکرٹ اور قیمتی اونی سوئٹر میں ملبوس، نفیس خوشبو سے معطر، کندھوں تک آتے ہوئے گھنگریالے بال سرخی مائل سنہرے رنگے ہوئے، سلیقے سے کیا ہوا میک اپ، اطالوی چمڑے کے جوتوں سے میچ کرتا ہوا پرس۔ وہ کوئی ماڈل گرل لگ رہی تھی۔ لیکن وہ مجھے نہ جانے کیوں کچھ پُر اسرار سی لگی۔ اس کے بچے آذر نوش کی شکل بھی بہت پیاری تھی مگر عجب سپاٹ سا تاثر تھا اس بچے کے چہرے پر جسے میں کوئی نام دے سکی۔ جب شہرزادے نے اپنے بچے آذر نوش کے داخلے کا فارم بھرا تو میں نے دیکھا کہ جائے پیدائش کے خانے میں تہران لکھا تھا یعنی وہ ابھی حال میں ہی ایران سے آئی ہے میں نے اندازہ لگا لیا۔ بچے

کے باپ کی جگہ اک فرنچ کینیڈین نام لکھا تھا۔

اور پھر آذرنوش ہمارے ڈے کیئر سینٹر میں آنے لگا۔ اس کی ماں سے بس کبھی کبھی ملاقات ہو پاتی تھی۔ دو تین ملاقاتوں کے درمیان صرف اتنا معلوم ہوا کہ ایران کے اسلامی انقلاب کے بعد یہ لوگ پناہ گزیں کی حیثیت سے کناڈا آئے ہوئے ہیں اور امیگریشن ملنے کا انتظار ہے۔ شہرزادے کی ٹوٹی پھوٹی انگریزی کی وجہ سے اس سے میری تفصیلی گفتگو نہیں ہوسکتی تھی لیکن میں پھر بھی انگریزی میں فارسی کے الفاظ ٹھونس کر کام چلا لیتی تھی، نہ جانے کیوں اس کے بارے میں جاننے کے لئے میں ہمیشہ مواقع ڈھونڈتی رہتی۔ ایک بار اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کا شوہر ابھی ایران میں پھنسا ہوا ہے، وہ آیت اللہ خمینی کو بُرا بھلا کہنے لگی تھی۔ مگر مری سمجھ میں نہیں آیا کہ پھر آذرنوش کے باپ کے نام کی جگہ اس نے کسی کینیڈین کا نام کیوں لکھوایا تھا۔ ظاہر ہے کہ میں اُس سے نہ پوچھ پائی حالانکہ میں تجسس کے مارے مری جا رہی تھی۔

آذرنوش پورے سینٹر کے لئے اک مستقل موضوعِ گفتگو تھا اور خاص کر اس کی کلاس ٹیچر ہیلن کے لیئے تو وہ ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ کہتی تھی کی آذرنوش بالکل بولتا نہیں، کلاس کے معمول میں حصہ نہیں لیتا، کسی سے دوستی نہیں کرتا۔ میں نے بھی محسوس کیا تھا کہ اس کے چہرے پر اک عجب بے تعلقی کا ایکسپریشن رہتا تھا، خالی خالی آنکھوں سے بس تکتا رہتا تھا۔ آذرنوش کے لنچ بکس میں اکثر باسی کھانا ہوتا، کبھی بغیر منہ دھوئے سینٹر آ جاتا تھا اور تقریباً ہمیشہ دن میں گیارہ بجے کے بعد آتا تھا اور روز سینٹر بند ہونے کے بعد دیر سے واپس جاتا تھا۔ اسے لینے کبھی کوئی بے بی سٹر آتی، کبھی کوئی ٹیکسی والا، کبھی ایک کینیڈین لڑکا آتا تھا۔ ڈے کیئر سینٹر شام کو چھ بجے بند ہو جاتا تھا لیکن آذرنوش ہمیشہ دیر سے جاتا تھا جس کی وجہ سے سینٹر میں شام کی شفٹ کرنے والی ٹیچر ہمیشہ خفا رہتی تھی۔ والدین اور ٹیچرس کی میٹنگس میں کبھی نہ شہرزادے آئی اور نہ آذرنوش کا باپ ہی آیا۔

آذرنوش پر میں خصوصی توجہ دیتی تھی۔ وہ ہمیشہ اکیلا کھیلتا تھا، یا تو زمین پر کھلونا گاڑیاں دوڑاتا، ان کی ٹکریں کراتا یا عجیب وغریب آوازیں نکالتا تھا۔ اس کی زبان کا وہی مسئلہ تھا جو عموماً امیگرنٹ بچوں کا ہوتا ہے، شروع میں بالکل کنفیوز ڈ ہو جاتے ہیں۔ لیکن آذرنوش تو فارسی بھی نہیں بولتا تھا، ڈے کیئر میں ایک اور ایرانی بچی آئی تھی جو میری انٹ سنٹ فارسی کے جواب میں خوب

فارسی بولتی تھی۔ آذرنوش مشکل سے کبھی ایک آدھ فارسی کا لفظ مجھ سے بول دیتا تھا لیکن اکثر نہ جانے کون سی جناتی زبان میں اپنے آپ سے باتیں کرتا رہتا تھا۔ ایک دن میں نے کھیل کے میدان میں بچوں کے ساتھ اسے کھیلتے دیکھا، اس نے ہاتھ میں پیڑ کی ایک سوکھی شاخ اٹھائی اور اور جھنڈے کی طرح بُلند کر کے فارسی اور کچھ اپنی جناتی زبان میں نعرے لگانے لگا۔ یہ بالکل اس طرح کے نعرے تھے جو میں نے ٹی وی پر شاہِ ایران رضا پہلوی کے خلاف ہونے والے جلسوں اور جلوسوں میں سُنے تھے۔

آذرنوش تصویریں بناتا تھا مگر ہمیشہ بنانے کے بعد پنسل سے کاٹ دیتا، اک روز میں اس کی کلاس میں گئی تو اس کی ٹیچر سب بچوں سے ''My familly'' کے عنوان سے تصویریں بنوا رہی تھی، سب بچے اپنے اپنے خاندان کے افراد کی تصویریں بنا رہے تھے جیسے عام طور چار سال کے بچے بناتے ہیں، دھڑ کی جگہ بڑا سا دائرہ، چہرے کی جگہ ایک چھوٹا دائرہ، منہ کی جگہ نقطے اور ہاتھ پاؤں کی جگہ لکیریں۔ ہر بچے کی تصویر میں ماں باپ تھے، بھائی بہن تھے، کچھ بچوں نے اپنے پالتو کتے، بلی اور چڑیا کی تصویر بھی بنائی تھی۔ آذرنوش نے بھی کچھ اس طرح کے دائرے اور ہیولے بنائے مگر بنانے کے بعد کالے رنگ سے پوری تصویر کاٹ پیٹ کر رکھ دی۔ اس کے بعد وہ کونے میں جا کر اکیلا lego کے بلاکس سے کھیلنے لگا، حسبِ عادت اس نے اک بندوق بنائی اور ٹھائیں ٹھائیں کرنے لگا۔ میں اس کے پاس جا بیٹھی اور lego بلاکس کی مدد سے ایک گھر بنایا، آذرنوش نے اس مکان کے احاطے میں ایک کھلونا کار لا کر رکھدی اور میری طرف دادطلب نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ پھر اسے نہ جانے کیا سوجھی کہ وہ اک کھلونا ٹرک اٹھا لایا اور میز پر تیزی سے دوڑا کر پورا گھر تہس نہس کر دیا اور میری طرف خالی آنکھوں سے تکنے لگا۔

میں عام طور پر شام کو پانچ بجے گھر چلی آتی تھی اور لیٹ شفٹ کرنے والی ٹیچر چھ بجے سینٹر بند کر کے گھر جاتی تھی۔ ایک دن شام کو ساڑھے چھ بجے اس کا فون آیا کہ ابھی تک آذرنوش کو کوئی لینے نہیں آیا، گھر پر فون کیا تو وہاں کوئی فون اُٹھا ہی نہیں رہا ہے۔ ٹیچر ماریا بہت غصے میں تھی کیونکہ وہ جمعہ کا دن تھا اور اس کی اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ڈیٹ تھی اور اسے گھر جانے کی جلدی تھی۔ سات بجے تک آذرنوش کو کوئی لینے نہیں آیا تو میں نے ماریا سے کہا کہ وہ سینٹر کے دروازے پر اک نوٹ لکھ کر آذرنوش کی ماں کے لئے لگا دے، اس میں میرا فون نمبر لکھ دے اور آذرنوش کو

میرے گھر پہنچا جائے۔

آذرنوش ماریا کے ساتھ میرے گھر آیا اور مزے سے بیٹھ کر ٹی وی دیکھنے لگا۔ اس نے ہمارے ساتھ کھانا کھایا، اپنی اماں کو ایک آدھ بار یاد کیا اور پھر ٹی وی دیکھنے لگا۔ میں نے اسے کچھ کلر پنسلیں اور کاغذ دے دیئے۔ وہ تصویریں بناتا رہا، کار، ٹرک، انسانی ہیولے مگر تصویر بنانے کے بعد وہ اسے بگاڑ دیتا، اس نے کالی اور گہرے ہی رنگ کی پنسلیں استعمال کیں۔ وہ تصویریں بناتے بناتے وہیں قالین پر سو گیا۔

رات دس بجے تک میں اسکے گھر فون کرتی رہی مگر وہاں کوئی فون ہی نہیں اُٹھا رہا تھا۔ ساڑھے دس بجے اس کی ماں کا فون آیا کی وہ سینٹر گئی تھی وہاں اسے میرا فون نمبر ملا تھا اور اب وہ اپنے بچے کو لینے آ رہی ہے۔ جب وہ آذرنوش کو لینے ٹیکسی سے آئی تو کسی خاص پریشانی یا ندامت کا کوئی اظہار نہیں تھا۔ میں نے جب اتنی دیر سے آنے کی وجہ پوچھی تو اس نے گول مول سا جواب دیا اور اس نے یہ بھی بتایا کی وہ آج کل نوکری کی تلاش میں ہے۔ میں نے کہا کہ اگر وہ مصروف تھی تو اس کا شوہر تو بچے کو لینے آ سکتا تھا۔ اس نے کہا کہ اس کا شوہر تو ابھی ایران میں ہی ہے۔ میں اس دن پوچھے بغیر نہ رہ سکی کی وہ شخص جس کا نام آذرنوش کے ایڈمیشن فارم میں لکھا ہے وہ کون ہے۔

شہزادے نے بہت ہی casualy بتایا کہ وہ تو اس کا دوست تھا اب اس کے ساتھ نہیں رہتا۔

اب آذرنوش کئی کئی دن سینٹر نہیں آتا تھا، دو مہینے سے فیس بھی نہیں آئی تھی۔ ایک دن شہزادے آئی پچھلی فیس ادا کی اور پانچ سو ڈالر دیئے کہا کہ اگلے دو مہینے کی فیس بھی لے لی جائے ورنہ اس کے پاس پیسے ختم ہو جائیں گے۔ ایک مہینے تک آذرنوش سینٹر آتا رہا اور پھر نہ جانے کہاں چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ شاید شہزادے کسی دوسرے شہر چلی گئی ہوگی اور اب تک تو اس کی immigration کی کاروائی بھی پوری ہو گئی ہوگی۔

ایک دن میں گروسری اسٹور سے واپس آ رہی تھی، ٹریفک لائٹ پر گاڑی روکے کھڑی تھی تو دیکھا کہ میک ڈونلڈ ریستوران کے قریب ایک بوڑھی کینیڈین خاتون کے ساتھ آذرنوش کھڑا لالی پاپ کھا رہا ہے۔ میں نے گاڑی سائڈ کر کے روک دی اور پوچھا کہ ماجرا کیا ہے۔ اس خاتون نے بتایا کہ یہ بچہ کافی دیر سے گروسری اسٹور کے آس پاس اکیلا گھوم رہا ہے یہ انگریزی بولتا ہے نہ فرنچ، اپنا ٹیلی فون نمبر بھی نہیں جانتا۔ آذرنوش بالکل پریشان نہیں نظر آ رہا

تھا۔ میں مخمصے میں پڑ گئی کی کیا کروں، بڑی بی اور آذرنوش کو گاڑی میں بٹھا کر ڈے کیئر سینٹر لے گئی، آفس میں سے ڈھونڈ کر شہرزادے کا فون نمبر نکالا، مگر وہ فون کٹ چکا تھا۔ ٹیلی فون ڈائیرکٹری میں بھی شہرزادے کا فون نمبر نہیں تھا۔ قریب کے پولس اسٹیشن پر لے جا کر رپورٹ لکھوائی۔ آذرنوش میری انگلی پکڑے ہوئے سب کچھ خالی خالی آنکھوں سے دیکھتا رہا۔ میرا دل نہیں مانا کہ اس کو پولس اسٹیشن پر چھوڑ دوں، بچے کی آنکھوں میں بھی اک خاموش التجا تھی، سو میں اسے اپنے ساتھ لے آئی۔

پولس والوں کو اپنا فون نمبر دے آئی کہ اگر اس کی ماں فون کرے یا کوئی اور اسے تلاش کرتا ہوا آئے تو مجھے فون کر دیں۔ میں ڈر رہی تھی کہ نہ جانے کس چکر میں پھنس جاؤں۔ دو دن انتظار کے بعد میں پولس آفسر کے ساتھ آذرنوش کو بچوں کی امداد کرنے والے ایک ادارے کے پاس لے گئی، اور اس کی ماں کا نام اور حلیہ بتا کر بچے کو ان کے حوالے کر آئی۔ میں کئی دن تک روز فون کر کے اس کے بارے میں پوچھتی رہی۔ وہاں کی انچارج نے بتایا کہ وہ وہاں آرام سے رہ رہا ہے۔

کوئی ایک ہفتے بعد معلوم ہوا کہ اس کی ماں آئی تھی مگر وہاں کی سوشل ورکر نے ماں کے حالات اور attitude دیکھتے ہوئے فیصلہ کیا کہ بچے کی دیکھ بھال اس کی ماں نہیں کر سکتی لہٰذا آذرنوش کو بچوں کے سینٹر میں رکھا جائے گا، اس کے میڈیکل اور نفسیاتی ٹسٹ ہوں گے، ماں کی مالی اور سماجی حیثیت کا کچھ عرصے تک جائزہ لیا جائے گا تب اس کے بعد کوئی فیصلہ ہوگا آذرنوش کے بارے میں۔ سچ پوچھیے تو یہ سن کر مجھے تھوڑا سا سکون ہوا۔

سال بھر بعد ایک دن شہرزادے مجھے ایک میٹرو اسٹیشن پر ایک فرنچ کینیڈین آدمی کے ساتھ نظر آئی، وہی طرح دار، معطّر شہرزادے، میں نے اسے پکارا، اس نے مڑ کر دیکھا... شناسائی کی اک چمک اس کی آنکھوں میں آئی مگر اس نے منہ موڑ لیا۔ میں لپک کر اس کے پاس گئی اور پوچھا کہ آذرنوش کیسا ہے۔ اس نے فرنچ زبان میں جواب دیا کہ مجھے شاید دھوکا ہوا ہے، نہ تو اس کا نام شہرزادے ہے اور نہ اس کا کوئی بیٹا آذرنوش ہے اور وہ تیزی سے میٹرو میں سوار ہوگئی۔ میں کھڑی سوچتی رہ گئی کہ میں نے تو صرف یہ پوچھا تھا کہ آذرنوش کیسا ہے؟ بیٹے کا تو میں نے ذکر کیا ہی نہیں تھا۔

☆☆

آنگن جب پردیس ہوا

حسب عادت اکرام نے اپنے گھر کی کال بیل دبائی پھر خود ہی خیال آیا کہ دروازہ اب کون کھولے گا۔ جیب سے چابی نکال کر دروازہ کھولا۔ گرمی سے اس کا چہرہ تمتما رہا تھا۔ سڑک کے رخ والی کھڑکی کے شیشے کے اس پار تیز دھوپ کی تمازت سے دہکتی ہوئی صاف شفاف سڑک سے ابخارات اٹھتے ہوئے لگ رہے تھے۔ اکرام نے کھڑکی پر پڑا ہوا دبیز پردہ برابر کیا تو آنکھوں کو ذرا ٹھنڈک محسوس ہوئی۔ ایئر کنڈیشنر آن کر کے جوتے اتار کر صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ دو تین منٹ آنکھیں بند کر کے پڑا رہا۔ ہاتھ بڑھا کر ٹیپ ریکارڈر چلا دیا۔ کل رات کو جو غزلوں کا کیسٹ جو وہ سن رہا تھا پھر بج اٹھا۔

''انشا جی اٹھو اب کوچ کرو اس شہر سے جی کو لگانا کیا''۔

وہ اٹھ کر کچن کی طرف خود سے کہتا ہوا چلا۔ ''اکرام اٹھو اب کھانا گرم کرو''

فرج کھول کر دیکھا کل رات جو قورمہ ہوٹل سے لایا تھا اس پر سستے تیل کی چکنائی کی موٹی سی تہہ جم گئی تھی۔ اسے گرم کر کے کھانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ تھوڑی سی اڑد کی دال رکھی تھی جو اس نے خود پرسوں پکائی تھی اسے ہی مائیکرو ویو میں گرم کر کے پھر سے بگھار لیا اور راستے میں تندور سے جو روٹی لایا تھا وہ میز پر سجا کر کھانا کھانے بیٹھ گیا۔

چھوٹے سے فلیٹ میں ہر طرف تنہائی گونج رہی تھی۔ پچھلے پندرہ سالوں سے بڑے سے سجے سجائے وِلا میں رہنے کے بعد اس چھوٹے سے خالی سے اپارٹمنٹ میں رہتے اسے بہت عجیب سا لگ رہا تھا... مگر اب بڑے مکان کی ضرورت ہی نہیں تھی ایک اکیلے آدمی کے لئے اتنے بڑے وِلا کی کیا ضرورت ہے اور خواہ مخواہ پیسے بھی برباد ہوں گے... اس فلیٹ میں اب بس ضرورت بھر کی چیزیں ہیں، ایک بیڈ، الماری، ایک پرانا والا صوفہ اور چھوٹی سی کھانے کی میز ہے

اور میں یعنی اکرام صدیقی ہے۔

قدسیہ نے جاتے وقت بہت اہتمام سے پیکنگ کی تھی۔ قیمتی کراکری، کرسٹل اور چاندی کی آرائشی چیزیں، قالین وغیرہ اپنے ساتھ کناڈا لے گئی تھی۔ باقی سب سامان بیچ دیا تھا۔ کناڈا کے امیگریشن کے لیئے درخواست دیتے ہی اس نے سامان بیچنے کا سلسلہ شروع کر دیا تھا... قدسیہ کی پلاننگ بھی زبردست ہوتی ہے۔ بڑا سا ولا چھوڑ کر اس فلیٹ کا انتظام بھی اس نے خود ہی کروایا تھا..

واہ قدسیہ بیگم! کس مہارت سے تم فرمانبردار بیوی بن کر سب اپنی سی کر لیتی ہو۔ سعودی عرب سے کناڈا کے لئے کوچ کرنے کا فیصلہ بھی تم نے مجھ سے کرالیا۔ ہر معاملے میں کیوں میں بے دست و پا ہو جاتا ہوں... اکرام نے جھوٹے برتن سنک میں رکھتے ہوئے سوچا۔

وہ آنکھیں بند کر کے صوفے پر پاؤں پھیلا کر لیٹ گیا، سوچ رہا تھا.. ایک تو بینک میں اتنا کام ہوتا ہے آجکل...... ابھی دوپہر کے تین بجے ہیں، آدھا پونا گھنٹا سو سکتا ہوں پھر چار بجے آفس واپس جانا ہے اور آٹھ بجے رات تک پھر وہی حساب کتاب، اعداد و شمار، کمپیوٹر کا اسکرین..... پندرہ برس ہو گئے یہ سب کرتے کرتے... امیگریشن ویزا لگنے کے بعد جب کناڈا گیا تھا تو کئی بینکس میں ملازمت کے لئے اپلائی کرنے گیا تھا... ہر جگہ وہی سوال، آپ کے پاس کینیڈین یا امیرکن تجربہ ہے؟.. یہاں سعودی برٹش بینک میں، پندرہ سال کیا جھک ماری ہے میں نے...؟

ٹیلی فون کی گھنٹی بجی... قدسیہ کا فون ہوگا کناڈا سے ... صبح ہی تو ای میل آیا تھا اس کا... اب کیا ہو گیا... میری تو ساری تنخواہ اب فون کالز اور ائیر ٹکٹس پر خرچ ہو رہی ہے... ہیلو!... کون؟... اسلم؟... دلی سے بول رہے ہو.. کیا ہوا... ہارٹ اٹیک ہو گیا امی کو... کب... تم جا رہے ہو الہ آباد... کتنے دن کی چھٹی مل سکتی ہے تم کو... صرف ہفتے کی... اچھا ذرا اپنا بینک کا اکاؤنٹ نمبر دو میں کچھ پیسے بھیج رہا ہوں اسپیڈی کیش سے دو دن میں پہنچ جائیں گے... اچھا سنو تم کہیں سے ای میل بھیج سکتے ہو... میرا ای میل نمبر لکھو...

ٹیلی فون واپس رکھ کر وہ صوفے کی پشت پر سر ٹکا کر آنکھیں سہلانے لگا۔ امی کو ہارٹ اٹیک ہو گیا ہے... اسلم ہفتے بھر کی چھٹی لے کر گیا ہے الہ آباد... اوہ خدا! مجھے تو پچیس جنوری تک کناڈا جانا ضروری ہے کیوں کہ چھ مہینے ہو جائیں گے مجھے کناڈا سے آئے ہوئے۔ وہاں کا امیگریشن رکھنے کے لئے ہر چھ ماہ بعد وہاں جانا ضروری ہے بڑی مشکل سے آفس سے پندرہ دن

کی چھٹی منظور کرائی ہے... آج بیس جنوری ہے... اسلم بہت گھبرایا ہوا لگ رہا تھا فون پر... وہ اگر امی کو دلی لے بھی جائے اپنے ساتھ تو..... اسلم کی بیوی بھی تو اسکول میں پڑھاتی ہے... امی دن بھر وہاں بھی اکیلی رہیں گی... اسلم سے کہتا ہوں کہ انھیں دلی لے جا کر کسی اچھے اسپتال میں داخل کرادے... آخر کتنے دن وہ اسپتال میں رہیں گی؟..

یہ مسئلہ تو پچھلے تین سال سے ہے جب ابو کا انتقال ہوا تھا... اب امی اس حالت میں ہیں اب تو اور بھی مشکل ہو جائے گی... اچھا اگر اسلم کے ساتھ وہ مستقل رہنے لگیں... مگر وہاں تیسری منزل پر اس کے چھوٹے سے فلیٹ میں وہ بالکل قید ہو جائیں گی... اور وہ اپنا گھر بھی کب چھوڑنا چاہتی ہیں... یہ اور مشکل ہے... ہمارے بزرگ بھی اس قدر جذباتی ہوتے ہیں... پہلے ہی ہم لوگ ان کی تنہائی کا خیال سے پریشان رہتے تھے... اسلم کہہ رہا تھا کہ امی کے دماغ پر بھی اثر ہے بہکی بہکی باتیں کر رہی ہیں..

اوہ خدایا! کیا کروں... سفید بالوں سے ڈھکا وہ سر... کمزور جسم... میرے وجود کا حصہ ہے... کیسے جا کر اپنی ماں کا سر گود میں رکھ کر ان کے بال سہلاؤں... میں ہر سال اپنی سالانہ مہینے بھر کی چھٹی میں کچھ وقت تو امّی کے لئے نکال ہی لیتا تھا... اس سال یہ جو کناڈا کے امیگریشن کا چکر چلا تو سالانہ چھٹی میں ٹورونٹو جانا پڑا اور امی سے ملنے نہ جا سکا... قدسیہ اور بچوں کو وہاں چھوڑ کر میں اپنی نوکری پر واپس جدہ آ گیا۔ سالم کو وہاں یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا ہے۔ سارہ اسکول جانے لگی ہے۔ قدسیہ کو کار خرید کر دے دی ہے۔ وہ تو سب سیٹ ہو گئے وہاں۔ قدسیہ کہتی ہے جانو! سعودی عرب کی نوکری مت چھوڑیئے گا ابھی، یہاں آپ کے اسٹینس کے مطابق جاب ملے تو آیئے گا... ورنہ آپ کو بہت فرسٹریشن ہوگا... سالم کی یونیورسٹی کی پڑھائی بہت مہنگی ہے... اور پھر سارہ...

اکرام کو لگا کہ جیسے اس کا سر پھٹ جائیگا ایک فلم سی اس کے دماغ میں چل رہی تھی... ابو کے انتقال پر بھی وقت پر exit re-entry لگ کر پاسپورٹ نہیں مل سکا تھا۔ میں ان کے سوئم کے دن پہنچ پایا تھا... ابو کے انتقال کے بعد یہ مسئلہ ہم دونوں بھائیوں کے سامنے تھا کہ امی اکیلی کیسے رہیں گی... عدت کے بعد میں نے اپنے پاس سعودی عرب بلا لیا تھا... بس تین مہینے رہیں پھر اپنے گھر کی یاد ستانے لگی کہتی تھیں کہ نہ جانے اختری بوا کے بیٹے کا کنبہ میرے گھر کا کیا حشر کر رہا ہوگا..

اختری بوا... اختری بوا کے خیال سے اکرام کے دل کو ذرا ڈھارس ہوئی... بوا کو ہم نے

بچپن سے ہی امی کے ساتھ دیکھا ہے... کتنی پرانی ملازمہ ہیں ہمارے گھر کی کچھ یاد نہیں پڑتا... اتنا یاد ہے کہ ان کے ایک بیمار سے، نکھٹو سے میاں بھی تھے جن کا بہت دن پہلے انتقال ہو گیا تھا... الیاس ان کا بیٹا میرا ہی ہم عمر ہو گا... اب تو وہ شاید کہیں چپراسی ہو گیا ہے... وہ چھوٹی سی کوٹھری جو ہمارے گھر کے پیچھے تھی اسی میں اختری بوا رہتی تھیں... میں اور الیاس بچپن میں کوٹھے پر چڑھ کر چلچلاتی دوپہروں میں پتنگ اڑایا کرتے تھے... افوہ! نہ جانے الیاس کے کتنے بچے ہیں اب... جب امی کے پاس جاتا ہوں تو ہر طرف کالی پیلی، ناک بہاتی الیاس کی اولاد گھومتی رہتی ہے... پورے گھر میں عمل دخل ہے ان کا...

قدسیہ کبھی جب امی ابو سے ملنے جاتی تھی تو بہت ناک بھوں چڑھاتی تھی کہ تمہارے گھر میں تو کوئی پرائیویسی ہی نہیں ہے... اس زمانے میں بوا کے چھ عدد پوتا پوتی سامنے والے برآمدے میں دن بھر ہڑدنگے لگاتے تھے۔ گرمی کے دنوں میں بوا خود کھری چارپائی گھر کے اندر والے برآمدے میں عین سیلنگ فین کے نیچے ڈالے اونگھا کرتی تھیں... ارے قدسیہ بیگم! یہ اختری بوا اور ان کا خاندان ہمارے لئے فرشتہ رحمت ہے... اسلم دلّی میں رہتے ہیں میں یہاں اور تسنیم باجی اپنے میاں کے ساتھ کویت میں... اختری بوا کی آل اولاد ہے جو امی ابو کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ اور ابو کے انتقال کے بعد سے تو اختری بوا چوبیس گھنٹے ہی امی کے پاس رہتی ہیں...

گھڑی کی طرف نظر ڈالی چار بجنے والے تھے، آفس بھی جانا تھا۔ باتھ روم میں جا کر ہاتھ منہ دھویا۔ ٹھنڈا پانی آنکھوں پر ڈالا تو ذرا سکون ہوا... چلو کم سے کم اختری بوا تو امی کے پاس ہیں... مگر بے چاری بوا تو خود ہی اتنی بوڑھی اور کمزور ہیں... امی کی ہی عمر کی ہوں گی... خیر اب تو اُن کی پوتی بھی تیرہ چودہ سال کی ہو گئی ہوگی وہ بھی دیکھ بھال کر لے گی۔ اکرم نے تولیہ سے منہ پونچھ کر سر میں کنگھا کرتے ہوئے آئینے پر نظر ڈالی تو اس کا اپنا چہرہ اس سے کچھ سوال کر رہا تھا۔

گاڑی چلاتے ہوئے دل و دماغ میں چلنے والی فلم بھی جاری رہی، بے دھیانی سے ڈرائیو کرتے ہوئے آگے والی کار سے ٹکر ہوتے ہوتے بچی۔ جھنجلا کر اکرام نے سر جھٹکا... کم بخت سوچ کی رفتار تو روشنی کی رفتار سے بھی تیز ہوتی ہے شاید... ابھی کل کی بات لگتی ہے امی کے کہنے پر ہی میں سلمیٰ خالہ کی بیٹی کی شادی پر کراچی گیا تھا۔ امی نے کہا تھا کہ سعودی عرب سے پاکستان کا ویزا آسانی سے مل جائے گا۔ تمہاری خالہ کا کوئی بیٹا نہیں ہے اس لئے ان کی بڑی بیٹی کی شادی

میں ضرور چلے جاؤ برسوں کا ٹوٹا ہوا رشتہ پھر سے جڑ جائے گا۔ امی کو گمان بھی نہیں تھا کہ یہ رشتہ ایسا جڑے گا کہ اور رشتے بکھر جائیں گے۔ خالہ کی دوسری لڑکی قدسیہ کیساتھ میری زندگی کی کڑی جڑ گئی... خالہ کو بھی زیادہ اعتراض یوں نہیں ہوا کہ لڑکی تو سعودی عرب میں ہی رہے گی اور لڑکا بھی اچھا کماؤ ہے اور پھر اپنی سگی بہن کا بھی معاملہ تھا...خوبصورت، سلیقہ مند، سمجھدار قدسیہ کس خوبصورتی سے میرا ہاتھ پکڑ کر پچھلے بیس سال سے زندگی کے کامیاب سفر پر چل رہی ہے۔

مگر ظاہر ہے قدسیہ اور میری زندگی کا اگلا پڑاؤ نہ انڈیا ہو سکتا تھا نہ پاکستان... یوں بھی ہمارے سامنے اپنے بچوں کے مستقبل کا سوال تھا...اور قدسیہ نے تو شادی کے اولین زمانے سے ہی ساری پلاننگ کر لی تھی۔ میں نے لاکھ چاہا کہ انڈیا میں ابو کے بنائے ہوئے مکان ''کاشانہ'' میں کچھ ردو بدل کرا دوں اپنے لئے اوپر کی منزل پر ایک بیڈ روم اور اچھا سا باتھ روم بنوا لوں مگر وہ ہمیشہ بہت رسانیت سے، پیار سے قائل کر دیتی تھی...

''دیکھئے جانو! ابھی سے وہاں کچھ کام کروانے سے کیا فائدہ۔ اب یہ ضروری تو نہیں کہ یہاں سے جاب ختم کر کے آپ الہ آباد ہی میں سیٹل ہوں''....ایک طرح سے قدسیہ بات بھی ٹھیک ہی کہتی تھی۔

گرمی کی چھٹیوں میں قدسیہ پی۔آئی۔اے سے انڈیا کا راؤنڈ ٹرپ والا ٹکٹ لیتی تھی اور ایک ڈیڑھ مہینہ کراچی میں اپنے گھر رہ کر، ہفتے دس دن کے لئے ہندوستان جاتی تھی... یہ بھی خوب ہے قدسیہ نے ہندوستان کو کبھی ہندوستان نہیں کہا یا تو انڈیا کہتی تھی یا جب پاکستان کی حب الوطنی کے موڈ میں بحث کر رہی ہوتی ہے تو بھارت کہتی ہے...اور اب تو میں بھی خود کبھی کبھی ہندوستان کے بجائے انڈیا ہی کہنے لگا ہوں۔ ہندوستان کے مختصر قیام کے دوران قدسیہ یا تو خود اپنے بیمار ہونے کی یا کسی بچے کی شدید بیماری کی داستان لے کر آتی تھی...اختری بوا بھی امی کی محبت اور وفاداری نبھاتے ہوئے کہتی تھیں۔

''اے ہے دلہن بی اور ان کے بچوں کو تو یہاں آتے ہی جراثیم کاٹنے لگتے ہیں اے ہے! بیگم صاحب کیا ان کا پاکستان کوئی لندن امریکہ ہے''۔

لاحول ولاقوۃ! یہ دماغ کم بخت کہاں سے کہاں بھاگتا رہتا ہے...ابھی آفس جا کر کچھ پیسے ہندوستان ٹرانسفر کراؤں گا...اسلم سے فون کر کے کہتا ہوں کہ امی کے لئے کسی نرس کا انتظام

کرلے جو مستقل ان کی دیکھ بھال کر سکے.. مغربی ممالک میں کم سے کم ڈھنگ کے نرسنگ ہوم تو ہیں جہاں بوڑھے لوگ اپنی عمر کے آخری دن سکون سے تو گزار سکتے ہیں۔

آفس میں کمپیوٹر کے اسکرین پر اعداد و شمار کے پیچھے سے بار بار ایک پرچھائیں سی ابھرتی مٹتی رہی۔ اکرام نے تھک کر گھومنے والی کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں لیکن آنکھیں بند کرنے کے بعد بھی پرچھائیاں مجسم ہو کر اس سے سوالی تھیں... نہ جانے ہمیشہ میری زندگی میں کوئی نہ کوئی وقت یا مسئلہ ایسا آتا ہے خود کو ایک دوراہے پر کھڑا پاتا ہوں۔

اب یہ سچوئشن بھی عجیب ہوگئی ہے... اب یہ کناڈا جانے کا چکر ہو گیا ہے... نہ جانے اس وقت کون ہوگا امّی کے پاس... وہ تو اپنا دکھ درد کسی سے کہنے کی عادی بھی نہیں ہیں... چپ چاپ دھرتی کی طرح سب برداشت کرتی ہیں... کبھی پلٹ کر نہیں پوچھا کہ انکے بیٹے کیا کماتے ہیں، کیا خرچ کرتے ہیں۔ دنیاوی چیزوں کی ہوس تو انھیں پہلے بھی نہ تھی اور اب ابّو کے انتقال کے بعد تو بالکل ہی بے نیاز ہو گئی ہیں، بس دور بیٹھی اپنی اولاد کو دعائیں ہی دیتی رہتی ہیں۔ چند دن ان کے بچے آ گئے تو عید ہو گئی ان کی... میری بھولی سی ماں اس وقت بستر پر پڑی خالی خالی آنکھوں سے نہ جانے ماضی کا کون سا منظر دہرا رہی ہوگی... اور یہاں سات سمندر پار ایک نئے ملک کی شہریت حاصل کرنے کا مرحلہ ہمارے سامنے ہے...

آفس سے گھر واپس آیا تو خالی گھر آج کچھ زیادہ ہی خالی لگ رہا تھا۔ کھانا کھانے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا.... تسنیم باجی کو کویت میں فون ملایا تو وہ رونے لگیں... کم سے کم وہ رو تو لیتی ہیں... وہ تو ابھی سردی کی چھٹیوں میں ہندوستان گئی تھیں انھیں واپس آئے پندرہ دن ہی ہوئے ہیں۔ ابھی تو فوراً ان کا جانا مشکل ہے ان کے بچوں کے اسکول کھل گئے ہیں۔

قدسیہ کو فون کرنے کے لئے خود کو تیار کر رہا تھا۔ مجھے معلوم ہے وہ اپنی توجیہات سے مجھے قائل کر دے گی... کہ میں کچھ زیادہ ہی react کر رہا ہوں... زیادہ ہی جذباتی ہو رہا ہوں ...وہ کہے گی کہ ابو کے انتقال کے بعد اس نے کہا تھا نا کہ ہم کو اپنا الہ آباد والا مکان ''کاشانہ'' بیچ دینا چاہئے اور اس پیسے سے اسلم دلّی میں دو تین کمروں کا مکان خرید لے اور امی کو اپنے ساتھ لے جائے تو آپ کا یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔

کس آسانی سے اس نے میرے ابّو کا بنوایا ہوا مکان بیچنے کی بات کہہ دی تھی۔ پتہ نہیں

یہ بات امی کے کانوں تک کیسے پہنچ گئی تھی۔انھوں نے اس بارے میں جو خط لکھا تھا وہ آج بھی میرے پاس ہے...کہاں ہے وہ خط؟... قدسیہ جب کناڈا جانے کے لئے سامان پیک کر رہی تو بہت سا کاٹ کباڑ، پرانے کاغذات وغیرہ پھینک دئے تھے...کہیں اس نے وہ گتے کا ڈبہ تو نہیں پھینک دیا جس میں امی اور ابّو کی پرانے خط اور کچھ پرانی تصویریں تھیں؟...لیکن امی کا وہ خط تو میرے دل پر نقش ہے۔انھوں نے لکھا تھا۔

''تم سب کی محبت کی میں احسان مند ہوں۔کبھی تم لوگوں کی ترقی کے راستے میں نہیں آؤں گی مگر مجھ سے میرا گھر میری زندگی میں نہ چھیننا،اس گھر میں تم سب کا بچپن اور جوانی، میرا سہاگ، یادوں کی پرچھائیاں بن کر ہر دم میرے ساتھ رہتے ہیں۔جب تک زندہ ہوں تم سب کے لئے میں تمہارے باپ کا گھر آباد رکھوں گی۔میرے بعد جو جی میں آئے کر لینا''۔

قدسیہ نے فون پر وہی کہا جسکی مجھے اس سے امید تھی۔

''جانو! آپ اتنا ٹینشن مت لیجئے،کہیں آپ طبیعت نہ خراب ہو جائے ویسے ہی آپ کا بلڈ پریشر ہائی رہتا ہے...آپ کناڈا تو آجائیں پھر دیکھا جائے گا...کیا کہا؟... انڈیا پہلے جائیں گے...اگر کہیں وہاں سے وقت پر نہ نکل سکے تو؟...پچیس جنوری تک آپ کو کناڈا پہنچنا ضروری ہے...آج کل تو یہاں امیگریشن کے قوانین بہت سخت ہوتے جا رہے ہیں... اتنی دیر میں امی کی خیریت بھی مل جائے گی...دور بیٹھے تو یوں بھی پریشانی زیادہ ہی لگتی ہے..میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ اس طرح امی کے اکیلے رہنے سے آپ بھی ٹنشن میں رہتے ہیں...''

وہ اور نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھی... قدسیہ کی یہ سب گفتگو خود اس کے ذہن میں چلنے والی فلم کے مکالمے سے گڈمڈ ہو رہی تھی۔اکرام نے فون بند کیا اور تھوڑی دیر تک بیٹھا سوچتا رہا پھر فون پر ایک نمبر ڈائل کیا۔

''ہلو!... معاف کرنا اتنی رات کو فون کر رہا ہوں ... یار احمد! ائر انڈیا کی ایک سیٹ چاہئے...جو بھی پہلی فلائٹ مل سکے...ڈائرکٹ دہلی جانے والی مل جائے تو اچھا ہے... ہاں ایمرجنسی ہے...ٹھیک ہے کل آفس میں فون کروں گا.... ہاں میرا پاسپورٹ میرے پاس ہی ہے اور اس پر exit re-entry لگی ہوئی ہے....وہ دراصل مجھے کناڈا جانا تھا نا دو دن کے بعد''۔

☆☆

الہ دین کا چراغ

شادی میں آئے ہوئے سارے مہمان رخصت ہو چکے تھے ،آج ہماری روانگی تھی۔اس بار اماں نے اپنے میکے کے گاؤں سے ایک بچے کو ہمارے ساتھ جانے پر راضی کرلیا تھا۔اس بار منو بھی ہمارے ساتھ جا رہا تھا۔ ڈیوڑھی کے پاس سب سامان بندھا ہوا رکھا تھا، باہر جیپ تیار کھڑی تھی۔منو برآمدے کے ستون سے لپٹا کھڑا تھا،اس کی ماں وہیں قریب میں فرش پر اکڑوں بیٹھی اسے سمجھا رہی تھی۔

''ارے دلہن بہت اچھے سے رکھہیں ،اسکول ماں بھرتی کریہیں ،جا منوا،کونو پریسانی کی بات ناہیں ہے۔''

وہ نیچی نظریں کیے کھڑا رہا۔دبلا پتلا سا،کالی رنگت والا یہ لڑکا شاید دس برس کا ہوگا۔ اس کی ماں کو بھی اس کی صحیح عمر نہیں معلوم تھی۔میں نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے پاس پلنگ پر بٹھالیا۔ اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر دلاسا دیا۔

''دیکھو ہم تمکو گھمانے لے جا رہے ہیں۔خوب کھانا پینا، طاقتور اور موٹے ہو جاؤ گے۔ اسکول میں بھرتی کرائیں گے،اور پھر تم روز ٹی وی بھی دیکھنا۔تھوڑے دن بعد گھوم پھر کر آجانا اپنی اماں کے پاس''۔وہ یوں ہی سر جھکائے کھڑا رہا۔

میری پانچ سالہ بیٹی آفرین کے لئے یہ سب کچھ بہت دلچسپی کا سامان تھا۔وہ اسے دلاسہ دیتے ہوئے بولی۔

''سنو ہمارے پاس ایک خرگوش اور ایک بلی بھی ہے۔تم اس سے کھیلنا''۔

اس کی ماں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''جا بچوا! تہری زندگی بن جائی، دلہن اور چچی بہوت ہی اچھی ہیں، یہاں تہرے چھ ٹھو بھائی بہن ہیں، پیٹ بھر کھائے کو بھی نہ ملی''۔

جیپ میں پیچھے بیٹھا منو بہت دیر تک مسجد کے سامنے والے نیم کے پیڑ کے نیچے کھڑے اپنے کئی بھائی بہنوں کو ہاتھ ہلاتا رہا۔ اس کا ایک چھوٹا ننگ دھڑنگ بھائی، کافی دور تک گاؤں کے کئی اور لڑکوں کیساتھ جیپ کے پیچھے پیچھے دوڑتا رہا۔

علی گڑھ تک ٹرین کے لمبے سفر کے دوران وہ مستقل کھڑکی کے پاس بیٹھا باہر جھانکتا رہا۔ آفرین اس کی موجودگی میں بہت دلچسپی لے رہی تھی۔

''امی اس کا ایڈمیشن ہمارے اسکول میں ہوگا''۔

اسلم نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ ''دیکھا جائے گا۔''

''مگر ابو، یہ ایڈمیشن ٹسٹ پاس کرلے گا، اسے ساری اے بی سی ڈی آتی ہے؟ سو تک گنتی آتی ہے؟ کون سی کلاس میں جائے گا، امی؟''

''امی! یہ کون سے کمرے میں رہے گا۔ میرے کمرے میں؟''

''افوہ! بھئی تم تو دماغ کھا گئیں، جب گھر پہنچیں گے تو دیکھا جائے گا۔''

میں نے اس کی کلرنگ بک اور اور رنگین پنسلوں کا ڈبہ بیگ سے نکال کر دیں تاکہ اس کے سوالات سے تھوڑی دیر کیلئے چھٹکارا ملے۔

مگر سوالات تو بہت سے ہمارے سامنے تھے۔ منو کے بارے میں جو کشمکش اور مکالمے میرے اور اسلم کے دماغ میں چل رہے تھے۔ اسے ہم دونوں جانتے تھے لیکن ایک دوسرے سے کچھ کہتے ہوئے ڈر رہے تھے۔

میں بظاہر ریل کی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی لیکن دل ہی دل میں خود سے الجھ رہی تھی ... اس طرح کسی کی اولاد کو ماں باپ سے چھڑا کر گھر کے کام کاج کے لئے ساتھ لے جانا.... جب اس کی ماں اس کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً اسے گھسیٹتی ہوئی لائی تھی تو مجھے ایسا لگا تھا جیسے کسی بکرے کو قربانی کے لئے لے جایا جا رہا ہو۔

اونہہ! میں نے سر جھٹک کر سوچا کہ آخر ہمارے پڑوس میں اشرف عالم صاحب کی بیوی بھی تو ایک سات آٹھ سال کے بچے کو لے کر آئی تھیں۔ تین سال سے ان ہی کے پاس ہے،

دن بھر پھرکی کی طرح کام کرتا ہے۔ مسز عالم کے گھر ملنے جاؤ تو وہ کیسے مزے سے بیٹھی باتیں کرتی رہتی تھیں اور وہ دس برس کا بچہ چائے کی ٹرے سجا کر لاتا تھا۔ جب آیا تھا تو سوکھا مارا تھا اب اچھا خاصہ ہو گیا ہے، تن پر بوٹی چڑھ گئی ہے..

میں نے اپنے دل کو دلاسہ دیا، منو بھی تو اتنا دبلا پتلا سا ہے، کم سے کم ہمارے گھر اسے پیٹ بھر کھانے کو تو مل جائے گا۔ ہم اس کو پڑھائیں گے ضرور، کسی قابل بنا دیں گے، کوئی ہنر سکھوا دیں گے ورنہ یہ نہ جانے کہاں قسمت پھوڑے گا۔ اس کی ماں تو اسے بمبئی اپنے بھائی کے پاس بھیجنے والی تھی... وہاں جا کر کون سا تیر مار لیتا، کسی چائے خانے یا ڈھابے میں میزیں صاف کرتا اور برتن دھوتا، ہو سکتا ہے کسی غلط کام میں پھنس جاتا..... میرے دماغ میں وہ ساری فلمیں گھوم گئیں جو ایسے بچوں کے بارے میں دیکھی تھیں.... منو کو تو گھر کے فرد کی طرح رکھیں گے ہم لوگ۔ یہ سب سوچ کر میرے دل کو ذرا سکون ہوا۔

گھر پہنچتے ہی منو کی میزبانی کی ذمہ داری آفرین نے لے لی، اسے اپنی کتابیں دکھائیں، بلی اور خرگوش سے ملوایا۔ دوپہر کو کھانے کے وقت جب سب لوگ میز پر بیٹھے تو آفرین نے منو کو بھی کھانے کے لئے آواز دی۔ میں نے اور اسلم نے گڑبڑا کر ایک دوسرے کو دیکھا، اماں نے آفرین سے کہا۔

''باولی ہوئی ہو، اس کا کیا کام ہے یہاں، وہ کھالے گا بعد میں وہیں باورچی خانے میں بیٹھ کر''۔

مجھ سے نہیں رہا گیا، ایک پلیٹ میں کھانا نکال کر منو کو دیا، وہ باورچی خانے میں بیٹھ کر کھانا کھانے لگا۔ رات کے کو کھانے کے وقت آفرین نے اپنی پلیٹ اٹھائی اور باورچی خانے میں منو کے پاس جا کر کھانا کھانے لگی۔ اماں نے اسے ڈانٹ کر واپس میز پر بلایا۔ میں اور اسلم سر جھکائے کھانا کھاتے رہے۔

ہمارے گھر میں ایک بوا صبح شام آ کر روٹی پکاتی تھیں اور برتن دھوتی تھیں۔ باقی کھانا میں خود بناتی تھی۔ مہترانی آ کر جھاڑو پونچھا کرتی تھی۔ ایک پارٹ ٹائم مالی آ کر لان کی دیکھ بھال کرتا تھا۔ گھر میں ہم دونوں میاں بیوی، ہماری بیٹی آفرین کے علاوہ اسلم کی ماں اور چھوٹا بھائی اختر بھی رہتا تھا جو یونیورسٹی میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اسلم جب سے اپنے

ڈیپارٹمنٹ کے ہیڈ ہوئے تھے تو روز شام کو اور اتوار کے پورے دن ان سے ملنے جلنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا، مستقل چائے بنانا ہوتا تھا۔ اور پھر اختر کے دوست احباب کا مستقل آنا جانا تھا۔ اماں کے بھی بہت سے چھوٹے موٹے کام تھے جن کے لئے مجھے دن بھر دوڑنا پڑتا تھا۔ جب آفرین چھوٹی تھی تو دن میں اس کی دیکھ بھال کے لئے بوا کی لڑکی صابرہ آتی تھی۔ دن میں اس سے اماں کو بھی دوسراہت ہوجاتی تھی اور وہ اپنے خیال میں اس کی تربیت بھی کرتی رہتی تھیں۔

اب آفرین اسکول جانے لگی ہے اور صابرہ کی بھی شادی ہوگئی اور وہ اپنے سسرال چلی گئی۔ اب دن میں جب میں اسکول چلی جاتی تھی تو اماں بالکل اکیلی ہوجاتی تھیں۔ بوا محلے کے ایک اور گھر میں بھی اوپر کا کام کرتی تھیں اس لئے وہ ہمارے گھر بس دو گھنٹے کے لئے دن میں آتی تھیں۔ مسز عالم نے ہی اماں کو راہ دکھائی تھی کہ وہ بھی اپنے گاؤں سے کوئی چھوٹا سا لڑکا لے آئیں اسے ٹرینڈ کرلیں۔ ان کے کہنے پر اماں نے اپنے میکے کے گاؤں سے ایک لڑکے کا انتظام کیا۔ منو کا باپ اماں کے گھر ہی پلا بڑھا تھا۔ وہ فصل کے زمانے میں کھیتوں پر مزدوری کرتا تھا۔

ہمارے گھر میں منو کے ذمے بہت سے چھوٹے بڑے کام خود بخود سپرد ہوتے چلے گئے۔ فرج میں ٹھنڈے پانی کی بوتلیں بھر کر رکھنا۔ اختر کے جوتوں پر پالش کرنا، جب اسلم گاڑی لے کر باہر جائیں تو گیٹ کھولنا اور بند کرنا، اختر کے لئے بازار سے دوڑ دوڑ کر سگریٹ لانا۔ نہ جانے اس کے آنے سے پہلے یہ کام کیسے ہوتے تھے۔ منو کو سارا گھر اپنے خیال میں ٹرینڈ کرنے لگا۔ اختر اسے چائے بنانا سکھانا چاہتے تھے تاکہ وہ وقت بے وقت ان کے دوستوں کے لئے چائے بنا سکے۔ ارشد اسے گاڑی دھونا سکھانا چاہتے تھے، میں اسے گھر کے فرنیچر کے جھاڑ پونچھ کرنا سکھانا چاہتی تھی۔ آفرین اس کے ساتھ کھیلنا چاہتی تھی۔ اماں چاہتی تھیں کہ وہ انکے پاؤں دباتا رہے۔ لیکن منو کا سب سے پسندیدہ کام بازار سے سودا لانا تھا۔

وہ اپنے آپ بھی بہت کچھ دھیرے دھیرے سیکھ رہا تھا۔ اس نے خود ہی برآمدے میں لگے ہوئے بڑے کلاک میں وقت دیکھنا سیکھ لیا یا شاید آفرین نے قابلہ بن کر سکھا دیا ہوگا۔ منو کو یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ٹی وی پر کون سا پروگرام کب اور کون سے دن آتا ہے۔

دن گذرتے گئے، دیکھتے دیکھتے چھ مہینے گذر گئے، روز مجھے خیال آتا کہ اس کی پڑھائی کا کچھ نہیں ہوا۔ ہر بار میں اپنے دل کو تسلی دیتی کہ ابھی تو وہ یہاں کے طور طریق سیکھ رہا ہے۔ ذرا

ایڈجسٹ ہو جائے تو شروع کریں گے۔ دوسرا مسئلہ یہ تھا کہ وہ پڑھے گا کہاں؟ چنگی کا اسکول بہت دور تھا اور اس کے علاوہ وہ صبح کے وقت تو اسکول جا بھی نہیں سکتا تھا کیوں کہ اماں کے اکیلے رہنے کا مسئلہ تھا۔ شام کی شفٹ میں کوئی اسکول آس پاس نہیں تھا۔

محلے میں ایک مسجد میں شام کو بچے قرآن شریف پڑھتے تھے۔ میں نے منو کو وہاں بھیجنا شروع کر دیا۔ وہاں اس کا بغدادی قاعدہ شروع ہوا۔ گنتی تو دس تک اسے آتی تھی میں نے سوچا تھا کہ حساب اسے خود سکھا دوں گی۔ شروع شروع میں کئی بار اس سے اس کا سبق سنا تو فرفر ''الف'' سے ''ی'' تک سنا دیتا تھا لیکن اگر درمیان میں سے کسی حروف تہجی پر انگلی رکھ کر پوچھو تو گونگے کا گڑ کھا کر بیٹھ جاتا۔

کئی بار سوچا کہ کہیں سے خوبصورت سا رنگین قاعدہ ڈھونڈ کر لا دوں گی، لیکن میرا اپنا اسکول کا ہی اتنا کام ہوتا تھا کہ فرصت ہی ملتی تھی۔ منو اکثر آفرین کے ساتھ اس کی پکچر ڈکشنری میں تصویریں بہت شوق سے دیکھتا تھا لیکن جب اماں آفرین کو منو کے ساتھ سر جوڑے بیٹھے دیکھتی تھیں تو فوراً منو کو ڈانٹ کر کسی کام کے لئے بلا لیتی تھیں۔

''تم یہاں تصویریں دیکھنے آئے ہو یا کام کرنے آئے ہو''۔

وہ مجھے سمجھانے لگیں۔ ''لڑکی کا معاملہ ہے، یہ گاؤں کے لڑکے بہت گنوں والے ہوتے ہیں۔ ویسے بھی یوں ڈھیل دو گی تو کھیل میں پڑ جائے گا، بالکل چوپٹ ہو جائے گا۔''

ایک دن اختر نے کہا۔

''بھابھی یہ جو آپ منو کو اپنے خیال میں مسجد میں قاعدہ پڑھنے بھیجتی ہیں یہ حضرت وہاں جاتے ہی نہیں۔ ادھر ادھر مٹر گشت کرتے رہتے ہیں۔''

بُوا نے منو سے شروع ہی سے حریفانہ رویہ اختیار کر لیا تھا۔ وہ اس بارے میں کیوں نہ گل افشانی کرتیں۔

''بیگم صاحب، کون سا کلکٹر لگ جائے گا پڑھ کر یہ، میں نے خود میرے تیرے گھر برتن مانجھ کر اپنے چھوٹے والے لونڈے کو اسکول میں بھرتی کرایا تھا، اب دسویں کا امتحان پاس کر کے ڈنڈے بجا رہا ہے۔ رکشہ وہ اب کھینچے گا نہیں، میں نے کہا میڈیکل کالج کے سامنے چائے کا ڈھابا لگا لے تو اس کی انسلیٹ ہوتی ہے، کھانے کو اسے اچھا چاہئے، پتلون، بشٹ کے

علاوہ کپڑا نہیں پہنے گا لاٹ صاحب۔بس کہتا ہے کہ یونسٹی (یونیورسٹی) میں چپراسی کی نوکری لگے کی تو بس وہی کروں گا''۔''اور کیا، آدھا تیتر آدھا بٹیر کس کام کا۔ارے ویسے بھی منو کا تو دماغ ہی بند ہے۔پڑھنے والا ہوتا تو کب کا سیکھ گیا ہوتا۔بس روز شام کو پڑھنے کے بہانے دو گھنٹے کے لئے غائب''۔اماں نے ہاں میں ہاں ملائی۔

مجھے معلوم تھا کہ مسجد کے مولوی صاحب مغرب کی نماز کے بعد نیم اندھیرے کمرے میں دس بارہ بچوں کو ڈانٹ ڈانٹ کر قاعدہ پڑھاتے ہیں اور بچے جھوم جھوم کر سبق رٹتے رہتے ہیں۔مولوی صاحب شرارت کرنے پر بچوں کو قبر کے عذاب سے بھی ڈراتے رہتے ہیں۔

منو کی تعلیم کے سلسلے میں میرا احساس جرم پھر تھوڑی دیر کے لئے جاگا تو میں اس کے لئے ڈھونڈ کر چکنے کاغذ والا رنگین اردو کا قاعدہ، پنسل اور کاپی لائی۔آفرین نے اسے اپنا ایک اچھا سے پنسل باکس، ربڑ اور شارپنر بھی دے دیا اور اس کا سارا پڑھائی لکھائی کا سامان اپنے ایک پرانے بستے میں رکھ دیا۔

میں نے کئی دن بیٹھ کر منو کو پڑھایا، حروف تہجی کو جوڑ کر دو حرفی الفاظ پڑھنا سکھانے شروع کئے اور سوچا کہ گنتی لکھنا سکھا دوں تو بعد میں اسے سودا سلف کا حساب لکھنا آجائے گا تو مجھے ہی فائدہ ہوگا۔وہ کاپی پر لکھتے میں کبھی لائن پر نہیں لکھتا تھا، گھڑی گھڑی پنسل چھیلتا رہتا تھا۔میں اسکول میں بچوں کو پڑھا کر دن بھر تھک جاتی تھی، منو سے سر کھپانے کا نہ وقت ہوتا تھا نہ طاقت۔اماں سے کہا کہ آپ ہی اردو پڑھا دیا کریں مگر ان کو تو دن بھر نماز اور وظیفوں سے فرصت نہیں ہوتی تھی۔

اماں مجھے سمجھاتی تھیں ''ارے یہ گھنا ہے۔عمر اس کی کم نہیں ہے۔اچھا خاصہ بارہ سال کا ہوگا، کاٹھی ایسی ہے کہ بچہ لگتا ہے۔ارے اس کا باپ بھی ایسا ہی کڑھ مغز تھا۔''

اختر سے کہا کہ ایک آدھ گھنٹہ روز اسے پڑھا دیا کرے تو وہ مذاق میں ٹال گئے۔

''اچھا بھابی! پہلے یہ بتا کہ ڈاکٹر بنے گا یا میری طرح انجینئر بنے گا''۔

گرمی کی چھٹیوں میں جب ہم لوگ کچھ دن کے لئے گاؤں جاتے تو وہ بھی ساتھ جاتا اور اپنی ماں سے مل آتا۔اس کی کوئی لگی بندھی تنخواہ نہیں تھی۔اس کی ماں گاؤں میں ہمارے جیٹھ سے غلہ لیا کرتی تھی۔ہم گاہے بگاہے ہزار پانچ سو روپے اس کے گھر بھیج دیا کرتے تھے۔

ہمارا بیٹا جمال پیدا ہوا، سارے گھر کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوگئی۔ آفرین نے اسکول میں نئی سہیلیاں بنالیں تھیں۔ اب منو کا جی بھی آفرین کے ساتھ کھیلنے میں نہیں لگتا تھا۔ وہ زیادہ تر بازار کے کام کرنے کے چکر میں رہتا تھا ایک کام کو بھیجو تو سمجھو کہ گھنٹے بھر کی چھٹی ہوجاتی تھی۔ ٹی وی پر وہ اپنے آپ گانوں کے ویڈیو والا چینل لگا لیتا تھا۔ سارے فلمی اداکاروں اور اداکاراؤں کے نام اسے یاد ہوگئے تھے۔

منو کا قد بھی بڑھتا جارہا تھا اس کے کاموں کی لسٹ بھی طویل ہوتی جارہی تھی۔ میں نے اسے کپڑوں پر استری کرنا بھی سکھا دیا تھا۔ ٹوسٹر میں توس سینکنے سکھا دیئے۔ آملیٹ بھی وہ بنا لیتا تھا، اس کی وجہ سے مجھے صبح اسکول جاتے وقت کی بھاگ دوڑ سے نجات مل گئی۔ منو میز پر برتن لگاتا، آملیٹ بناتا، توس سینکتا گرم گرم چائے بنا کر دیتا اور ہم سب تیار ہو کر ناشتہ کر کے اپنے اپنے کام پر چلے جاتے۔ وہ ہی جھوٹے برتن سمیٹا، میز صاف کرتا، ڈرائنگ روم کی جھاڑ پونچھ کرتا، اور اگر مہترانی نہ آئے تو سارے گھر میں جھاڑو اور پوچھا لگاتا تھا۔ قصائی کی دکان سے گوشت بھی وہی لانے لگا تھا۔ دوپہر کو کھانے کے برتن لگا کر تیار رکھتا تھا۔ کھانے کے بعد میز صاف کرتا تھا۔ اسکول میں بھی استانیاں مجھ سے کہنے لگیں تھیں کہ اب میں کافی ریلکس لگتی ہوں۔ شام کو میں اسے سودا سلف لانے بھیج دیتی تھی۔ سودے کے پیسوں کا حساب وہ کسی نہ کسی طرح ٹھیک سے کرلیا کرتا تھا۔ ہمارے گھر کا ٹیلی فون نمبر، رشتہ داروں کے ٹیلی فون نمبر اس نے خوب یاد کر لئے تھے۔

وقت یوں ہی دبے پاؤں گذرتا گیا۔ آفرین اب ہائی اسکول میں آ گئی تھی اور جمال تیسری کلاس میں آ گیا تھا۔ میں اسکول کی ہیڈ مسٹرس ہوگئی۔ منو جوان ہوگیا تھا۔ اکثر لہک لہک کر فلمی گانے گاتا۔ آئینے کے سامنے بار بار جا کر بال بناتا۔ اماں کو اس کی یہ ادائیں سخت زہر لگتی تھیں۔ مردم شماری کے لئے سرکاری کارندے گھر گھر جا کر شمار کر رہے تھے۔ منو کو آفرین نے اردو میں اپنا نام لکھنا سکھا دیا تھا لہٰذا اس کے نام کے ساتھ پڑھا لکھا درج کیا گیا۔

دوسرے دن میں نے اسے جمال کے نئے کمپیوٹر کی جھاڑ پونچھ کرنا سکھاتے ہوئے سوچا کہ میں منو کے لئے یونیورسٹی کے تعلیم بالغاں کے شعبے سے جا کر ایک اردو پڑھانے کا تعلیمی Kit لے آؤں گی۔ ایک مہینے بعد وہ کٹ آیا، ایک مہینے میں اسے کہیں رکھ کر بھول گئی۔ اس کے بعد ہمارے اسکول میں استانیوں کے لئے بچوں کے پڑھانے کے نئے اور دلچسپ طریقوں کے

بارے میں ورک شاپ شروع ہوگئی تو پورا مہینہ اس مصروفیت میں گذر گیا۔

میری نند ریحانہ امریکہ سے اپنے بچوں کے ساتھ آ گئیں۔ گھر میں خوب چہل پہل ہوگئی۔ ایک اتوار کی صبح ہم سب ناشتے کی میز پر جمع تھے کہ ایک دم ریحانہ کو اپنے بچپن کی یاد آ گئی جب وہ صبح صبح گرم گرم جلیبیاں کھاتی تھی۔ میں نے منو کو فوراً بازار بھیجا اور وہ سائیکل پر گیا اور دس منٹ میں گرم گرم جلیبیاں میز پر موجود تھیں۔

ریحانہ نے کہا۔

''بھابھی انڈیا میں یہ ہی تو ٹھاٹ ہیں، منو تو آپ کے لئے الہ دین کے چراغ والا جن ہے۔ رات دن حاضر ہے سب کا حکم بجانے کیلئے''۔

اماں نے دھیرے سے کہا۔

''ارے ذرا آہستہ بولو ورنہ اس کا دماغ خراب ہو جائے گا۔ بچپن سے اب تک ہم نے اسکی ٹریننگ کی ہے، کوئی آسان کام ہے''۔

☆☆

گھر لوٹ کے جانے کا تصوّر

آج جمعے کی شام تھی اسلئے بطحی کے بازار میں بہت بھیڑ تھی۔ ہمیشہ کی طرح ٹیکسیوں اور پرائیوٹ کاروں کا دریا سا بہہ رہا تھا۔ سارا بازار برقی روشنیوں سے روشن تھا۔ الکٹرونک سامان بنانے والی مشہور کمپنیوں، سونی، L.G، سنسوئی، سیمسنگ کے بڑے بڑے بورڈوں سے سجی دکانیں ہمیشہ کی طرح پررونق تھیں۔ فٹ پاتھ پر سستی گھڑیوں کے ڈھیر اور چائنا کے بنے سستے کھلونوں اور کپڑوں کی دکانوں کے سامنے کافی بھیڑ تھی۔ پیدل چلنے والوں کے لئے سڑک کراس کرنے والے پُل پر مردوں کے غول کے غول لدے ہوئے تھے۔ اکا دکا کوئی عورت کالے برقعے میں چھپی اپنے شوہر کے ہمراہ نظر آجاتی تھی۔

زبیر نے اپنی ٹیکسی ہر مال دوریال والی دکان سامنے کھڑی کردی جس کے اندر چائنا اور تائیوان کا سستا مال بھرا ہوا تھا۔ حالانکہ وہاں ممنوع الوقوف ((No Parking) کا بورڈ لگا تھا مگر جمعے کی شام پُل کے قریب اسی دکان کے سامنے ہی اشتیاق نے مغرب کی اذان سے پہلے ملنے کو کہا تھا... اب بس وہ جلدی آجائے ورنہ ٹریفک پولس والا آگیا تو مشکل ہوجائے گی... زبیر نے ڈرائیور سیٹ سے سرٹکا کر پاؤں پھیلاتے ہوئے سوچا۔ تھوڑی ہی دور پر ماڈرن طرز کی بڑے بڑے شیشوں کی کھڑکیوں والی پرنس سلمان بلڈنگ میں نیا شاپنگ سینٹر جگمگا رہا تھا۔ اسے خیال آیا کہ ابھی چند برس پہلے یہاں اس عالی شان پرنس سلمان بلڈنگ کی جگہ پر بڑا سا کھلا میدان تھا، جمعہ کی شام سب یہاں ہی جمع ہوا کرتے تھے۔ پاکستانیوں کا زیادہ تر اڈہ دوسرے محلے شمیسی میں ہوتا تھا۔ یہاں، سوڈانی، یمنی، ترکی، مصری، یوپی والے، ملیالی، حیدرآبادی، راجستھانی، بہاری لوگوں کا قبضہ تھا۔ بھانت بھانت کے لوگ بھانت بھانت کی بولیاں۔ یہ لوگ

جو مزدور، کاریگر وغیرہ تھے ریاض اور آس پاس کے گاؤں سے اور شہر سے دور فیکٹریوں سے ہر ہفتے آکر یہاں ہی ملتے تھے۔اب وہ میدان نہیں رہا اور اس کی جگہ یہ بلڈنگ بن گئی تو ان لوگوں نے اپنی اپنی ملنے کی جگہیں پُل کے نیچے، مختلف گلیوں میں یا کسی پارکنگ لاٹ میں مقرر کرلیں ہیں۔

زبیر نے گھڑی پر نظر ڈالتے ہوئے سوچا کہ مغرب کا وقت ہونے والا تھا...اشتیاق نہ جانے کہاں رہ گیا۔ابھی اذان ہو جائے گی تو یہاں کھڑے رہنا بھی مشکل ہو جائے گا۔ اشتیاق پرسوں چھٹی پر انڈیا جار ہا ہے.اس کے ہاتھ کچھ سامان اور خط گھر بھجوانے تھے...پچھلے ہفتے گھر سے اماں کا خط آیا تھا پھپھی کے دیور کا بیٹا اشتیاق جو برتنوں کی اک دکان پر سیلز مین ہے چھٹی پر انڈیا آنے والا ہے اس کے ہاتھ خط اور سامان بھجوادینا۔

اماں کی فرمائشوں کی ایک لمبی لسٹ تھی...اب دوسری بہن کی شادی کی تیاریاں شروع کردی ہیں، تکئے کے غلاف اور چادریں اگر ابھی سے نہ تیار کی ہوئیں تو مشکل ہو جائے گی اس لئے ایک تھان اچھی والی کیٹی کے کپڑے کا بھیج دینا...اور پروین کی شادی کے بعد سسرال میں پہلی عید ہے اس کو عیدی کا جوڑا، اور کچھ برتن اور میوہ مٹھائی تو بھیجنی ہی ہے اس کے لیے بھی ایک اچھا جوڑا بھجوادینا اس کی بیوی زرینہ کو عید پر سعودیہ عرب سے آیا ہو جوڑا نہ ملا تو وہ لوگوں میں شان سے کیا دکھائے گی لہذا زبیر نے خود ہی اسکے لئے بھی ایک جوڑا کپڑا لے لیا۔اماں کو کچھ نہ بھیجوں تو زن مریدی کا طعنہ مل جاتا ہے ، اس لیے ان کے برقعے کا کپڑا بھی خرید لیا...رمضان شروع ہونے والے ہیں اس لیے بادام اور کھجوریں تو بھیجنی ہی ہیں...زبیر نے فرمائشوں کے علاوہ خود ہی سوچ کر سارا سامان خرید کر پیکٹ بنا کر تیار کرلیا تھا۔ اماں کہتی ہیں کہ سحری میں سعودیہ کے بادام کی تر ی (حیریرہ) اچھی بنتی ہے ،ادھر انڈیا کے بادام بہت چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔
زبیر کو سوچ کر ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی...

''اب خدا جانے اشتیاق کے پاس سامان لے جانے کی کی جگہ ہوگی کہ نہیں.'' زبیر نے سوچا۔اشتیاق خریداری کے سامان سے لد پھند اپل سے اتر تا نظر آیا۔قریب کی کئی مسجدوں سے اذان کی آواز آئی تو اس نے گاڑی اسٹارٹ کردی، اور جلدی سے دروازہ کھول کر اشتیاق کو اندر بٹھا کر چلدیا۔اشتیاق کو چنو بھائی کے روم پر جا کر بھی ان سے بھی کچھ سامان لینا تھا۔

''بھیا بہت راہ دکھائی، ہم تو تہرے انتظار میں کبو سے کھڑے ہیں''۔جب اپنی طرف

کا کوئی آدمی مل جاتا تھا تو نہ جانے کیوں ادبدا کر زبیر اپنی ہی بولی میں بات کرنے لگتا تھا۔

''کا بتائی زبیر بھائی، دوسال بعد چھٹی جارہے ہیں تو سامان کھریدے کا توپڑی نا''۔

''کتنے دن کی چھٹی پر جارہے ہو؟'' زبیر نے اس کے خریداری کئے ہوئے تھیلوں اور کارٹنوں پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔

''اب دیکھو، تین مہینے کی اکزٹ ری انٹری لگی ہے۔ کفیل تو ہمارا بھلا آدمی ہے، لیکن اگر زیادہ دن غائب رہے تو فرنٹ نہ ہو جائے۔ اور پھر چھٹی پر زیادہ دن گھر رہیں تو وہاں بھی اماں ابا اور سب گھر والوں کا دم پھولنے لگتا ہے کہ کہیں واپس سعودیہ نہ گئے تو کیا ہوگا۔'' اشتیاق نے کہا۔

''ہم سے کیا کہتے ہو بھائی۔ دس برس سے یہی کہانی چل رہی ہے''۔

زبیر نے تیزی سے یوٹرن بناتے ہوئے کہا۔

بازار میں جگمگاتی دکانوں کے پیچھے پتلی سی گلی میں ایک پرانی بلڈنگ میں چنو بھائی کا گھر تھا۔ گلی کے اندر داخل ہوتے ہی باسی مچھلی کی بو نے بتادیا کہ یہاں پر بنگلہ دیشیوں کا ڈیرا ہے۔ چنو بھائی کے چھوٹے سے خستہ حال فلیٹ میں حسب عادت بھیڑ لگی تھی۔ یہ ہی وقت ہوتا ہے جب ہندوستان سے ٹیلی فون کی لائن ملتی ہے۔ وہاں کا آپریٹر جہاں چاہو وہاں کا نمبر ملا دیتا ہے اور لوگوں کے لئے پچاس ریال میں آدھے گھنٹے گھر پر فون کر لینا گھاٹے کا سودا نہیں تھا۔ یوں عام فون سے کرو تو اس سے دگنے پیسے لگتے ہیں۔ دوسرے کمرے میں فون پر کوئی چیخ چیخ کر باتیں کر رہا تھا۔

''اماں! سلام علیکم۔ خیریت ہے... کیا؟... اب دیکھئے زیادہ دماغ خراب نہ ہو شکیل کا... سارا دن آوارہ گردی ہی تو کرتا ہے ہیرو بن کر۔ سارا دن پھول پور کے بازار میں چائے کی دکان پر بیٹھنے سے فرصت ہو تو کچھ کرے گا نا۔ ارے کیا یہاں ویزا پیڑ پر لٹکتے ہیں اماں جو بھیج دوں۔ کاہے نہیں کھیتی باری دیکھتا۔ کوئی لاٹ صاحب ہوگیا ہے ہائی اسکول کر کے، کیا کہیں گورنر لگ جائے گا کیا... ہاں! ہاں! بھیجے تو تھے پیسے پچھلے مہینے، مل گیا ڈرافٹ''۔

ایک صاحب چنو بھائی سے پوچھ رہے تھے۔

''ایک پٹی کتنے کی پڑ رہی ہے آجکل... اور کتنے دن میں پہنچیں گے پیسے گھر پر، ذرا ایمرجنسی ہے، اور بھیا گارنٹی ہے نا پہنچے کی؟''۔

چنو بھائی کو غصہ آ گیا۔

''تم کاہے نہیں اپنا پیسوا بنک سے بھجوادیتے اگر اتنی ہی پریشانی ہے تو۔ ہم تو لاکھوں ریال روز ادھر سے ادھر کرتے ہیں''۔

اسی دوران دوسرے فون پر چنو بھائی ان لوگوں کے نام اور فون نمبر لکھ رہے تھے جو اپنے گھروں سے انڈیا کے آپریٹر کے ذریعے فون پر بات کرنا چاہتے تھے۔

''کہو چنو بھائی، بہت مال توڑ رہے ہو''۔ زبیر نے پرانے صوفے پر سے الم غلم سامان سمیٹ کر اس پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا، اس کی کمر دکھ رہی تھی۔

''ارے کہاں کا مال۔ اب تو یہ سالے کیرالا والے پندرہ پندرہ ریال میں موبائل سے فون کراتے پھر رہے ہیں بازار میں... اب تو اس دھندے میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ ہٹاؤ ان باتوں کو، آج بہت بڑھیا نہاری پکائی ہے کھا کر جانا''۔ چنو بھائی نے چائے کا پانی گیس کے چولہے پر چڑھاتے ہوئے کہا۔ چھوٹے سے کچن میں نہاری کی خوشبو پھیلی ہوئی تھی۔

''ارے بھیا! ہم پوربیا ارہر کی دال کھانے والے کب سے نہاری، پائے کھانے لگے''۔ زبیر نے ہنس کر کہا۔

اشتیاق بول پڑا۔ ''اب سعودیہ میں آ کر بھی ارہر کی دال کھائیں تو پھر یہاں آئے کا فائدہ۔'' کھانے کے دوران چنو بھائی گاؤں کی باتیں کرتے رہے۔ پرانی اسکول کے زمانے کی باتیں، چھپ کر گاؤں میں نوٹنکی دیکھنے کی باتیں، گھر کے مسائل وغیرہ۔ کھانا کھا کر جب وہ فارغ ہوئے تو رات کے نو بج گئے تھے۔ چنو بھائی کے گھر سے نکل کر کوئی سواری لینے کے لئے وہ گاڑی مین سڑک پر لے آیا۔ بازار کی بھیڑ اور رونق کچھ اور بڑھ گئی تھی، مگر اس کے دل میں جیسے زیرو واٹ کا بلب سا جل رہا تھا۔ وہ یوں ہی بے دھیانی سے شہر کی چکنی چمکتی سڑکوں پر گاڑی چلاتا رہا۔

''اب ایسا لگتا تھا کہ اس شہر کی سڑکوں پر گاڑی خود بخود مڑ جاتی ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کتنی نئی بلڈنگیں ریاض میں بن گئی ہیں''۔ کنگڈم ٹاور کی بلند و بالا عمارت پر جلتی بجھتی روشنیوں پر نظر ڈالتے ہوئے اس نے سوچا۔ اس کے سامنے ہی یہ عمارت بننی شروع ہوئی تھی۔ دن رات نہ جانے کتنے ہندوستانی اور پاکستانی مزدور اس کے بنانے میں لگے ہوئے تھے۔ علیا کے فیشن ایبل بازار سے گذر کر وہ شہر سے باہر نکل آیا... اس نے گاڑی بے ارادہ ہی ائر پورٹ والی ہائی وے پر موڑ دی... رات میں صحرا کا سناٹا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

''چلو ٹھیک ہے'' ...اس نے سوچا... ایک کوئی سواری ائرپورٹ سے اٹھا کر کام ختم۔ پھر روم پر جا کر جلدی سو جایا جائے، آج کے ڈیڑھ سو ریال تو ٹیکسی کمپنی کو دینے کے ہو ہی گئے ہیں۔ ایئرپورٹ کے ٹرپ سے کچھ اور کمائی ہو جائے گی...بس کافی ہے...آج وہ کچھ زیادہ ہی تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ آج کافی وقت گھر سامان بھیجنے کی خریداری میں نکل گیا تھا۔

وہ ایئرپورٹ والی سڑک پر چل رہا تھا اور سوچوں کا سفر بھی جاری تھا...تین سال ہو گئے گھر گئے ہوئے...پچھلے مہینے کسی کے ہاتھ زرینہ کا خط آیا تھا کہ اب مجھے اپنے بچوں کے لئے بھی سوچنا چاہئے....ابھی تو میری دو بہنیں شادی لائق ہیں۔ چھوٹا بھائی نہ جانے کتنے سال سے بی اے میں فیل ہو رہا ہے کچھ نہیں کرتا ... چھ بیگھا زمین ہے اپنے پاس، اس میں کتنا غلہ پیدا ہو سکتا ہے..ریڈ لائٹ پر کھڑا وہ سوچ رہا تھا...

لائٹ ہری ہوئی تو جیسے خود بخود گاڑی چل پڑی۔ ایئرپورٹ سے ایک مصری فیملی کو بٹھا کر ان کی منزل پر پہنچایا اور پھر سیدھا اپنے روم پر چلا گیا۔ الیاس اور اعظم ابھی نہیں آئے تھے۔ الیاس درزی کی دکان پر کام کرتا تھا اور اعظم اس کی طرح ٹیکسی چلاتا تھا۔ اعظم کا معمول تھا کہ رات کو بارہ بجے کے بعد آتا تھا اور ساتھ میں کوئی نہ کوئی ویڈیو فلم کا لے کر آتا تھا۔ فلم دیکھ کر ہی سوتا تھا۔ زبیر اس کی اس عادت سے بہت بیزار تھا، لیکن آج وہ خود ہی ایک ویڈیو کیسٹ وی سی آر پر لگا کر آرام سے لیٹ گیا۔ بھاڑ میں جائے سورایاں اور ٹیکسی... اس نے سوچا۔

اسکرین پر شلپا شیٹھی برائے نام کپڑے پہنے ٹھمکا لگا رہی تھی۔ ''جوانی کا عالم بڑا بے خبر ہے، دوپٹے کا پلو کدھر کا کدھر ہے''۔ ''لاحول ولا قوۃ،'' وہ بے ارادہ کہہ اٹھا، لیکن ویڈیو بند نہیں کیا۔ اس کی آنکھیں مندنے لگیں۔ شلپا کے چہرے میں اسے اپنی بیوی زرینہ کا چہرہ نظر آنے لگا۔ تین برس ہو گئے گھر گئے ہوئے۔ چھوٹے والے بچے کی تو شکل بھی ابھی میں نے نہیں دیکھی ہے... زرینہ سے تنہائی میں ملنے کے لئے بھی اپنے ہی گھر میں کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں۔ اماں کا بس نہیں چلتا کہ مجھے اپنے کولھے سے لگائے بیٹھی رہیں۔ رات کو بہت مشکل سے چھت پر اپنے کمرے میں جانے کا وقت ملتا تھا۔ اماں کا خیال تھا کہ بیوی کہیں پٹی نہ پڑھا دے کہ میں ڈرافٹ اس کے نام بھیجنے لگوں...شلپا شیٹھی کے پتلی کمر جھٹکے کھا رہی تھی۔ ویڈیو چلتا رہا اور وہ سو گیا۔

رات بھر خواب میں دھان کے کھیت، گاؤں کی گلیاں، زرینہ، ریاض کی سڑکیں، ہوائی

جہاز، جانے کیا کیا گڈمڈ ہوتا رہا۔صبح اٹھا تو بالکل باہر جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا لیکن سات بجے صبح اسکول کے کئی بچوں کو اسکول لے جا کر چھوڑنا ہے ورنہ گڑبڑ ہو جائے گی۔اس کام کے اچھے پیسے مل جاتے ہیں اس لئے اٹھنا تو پڑے گا ہی زبیر میاں...اس نے خود سے باآواز بلند کہا

''اٹھ چندا تیرا وہ ہی دھندا''

جلدی سے منہ دھوکر، کپڑے بدل کر نکل کھڑا ہوا۔ چار گھروں سے بچوں کو لیا اور اسکول چھوڑنے کے بعد ناشتہ کرنے اپنے مخصوص بوفیہ (چھوٹا ہوٹل) پہنچ گیا۔وہ ناشتہ اسی وقت اسی جگہ کیا کرتا تھا۔کڑک چائے پیتے ہوئے اس نے سگریٹ سلگایا۔آج ریاض بھٹی بھائی کاؤنٹر پر نہیں تھے۔ان کے ساتھی بشیر بھائی نے بتایا۔

'وہ، وہ تو جی قصیم گئے ہوئے ہیں۔پرسوں ان کے رشتے کے چچا فوت ہو گئے۔وہی چاچا جو قصیم کے ایک گراج میں پچھلے بیس برس سے کام کر رہے تھے''۔بشیر بھائی پتیلے سے چھولے مرغ کا سالن پلیٹ میں ڈالتے ہوئے بولے۔

''جی! بندے نے اپنے خاندان کو کیا سے کیا بنا دیا پاکستان میں ..بیٹیوں کی شادیاں دھوم سے بڑے بڑے گھروں میں کر دیں۔اب بڑے لڑکے کو بھی بلوانے والے تھے...ویزا نکلوانے والے تھے بیٹے کے لئے....بس یوں ہی چپ چپاتے رات کو سوتے میں گذر گئے...اللہ کی مرضی....ان کی میت پاکستان بھجوانے کا انتظام کرنا تھا.... اسی کے لیے ریاض بھائی گئے ہیں...میت بھجوانے میں بہت بھاگ دوڑ کرنی پڑتی ہے...اب دیکھو کتنے دن لگتے ہیں''

''یوں ہی چپ چپاتے رات کو سوتے میں گذر گئے''۔

زبیر ہوٹل سے نکلا تو دن بھر یہ جملہ اس کے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔وہ سواریوں کو ان کی منزلوں پر چھوڑتا رہا۔سڑکوں کے چکر لگاتا رہا.....سوچوں کا لامتناہی سلسلہ بھی ساتھ ساتھ چلتا رہا...وہ گویا خود سے ہی دل ہی دل میں الجھتا چلا جا رہا تھا۔اب کچھ زیادہ سواریاں بھی نہیں ملتیں... ایک سواری کے لئے تین تین ٹکیسیاں لپکتی ہیں...کیوں؟...، کب تک، میں اس چکر میں لگا رہوں...

وہ خود سے الجھتا رہا... ہائی اسکول پاس کر کے یہاں آ گیا تھا سوچا تھا کہ دو چار سال یہاں رہ کر کچھ پیسے جمع کر کے ایک دکان گاؤں میں کھول کر بیٹھ جاؤں گا۔۔پہلے سال یہاں کی کمائی سے وہ ادھار چکایا جو سعودیہ کے ویزے اور ٹکٹ کیلئے ایجنٹ کو دینے کے لئے لیا تھا۔اس

کے بعد... لیکن اس کے بعد... سارے گھر کی بڑھتی ہوئی ضرورتوں کا بوجھ اور سعودیہ سے گئے ڈرافٹوں کا کچھ ایسا جادو کہ واپس جانے کی بات ہی نہیں آتی تھی۔ گھر والے بھی میرے واپس آنے کی بات کرنا بھول گئے...

بہنوں کو اچھے جہیز اور کھاتے پیتے گھرانوں کی تمنا... اماں کو یہ فکر کہ چھوٹے بھائی کے لئے یا تو وہاں سے ویزا خرید کر بھیجو یا انڈیا میں ہی کسی دھندے کے لیے رقم مہیا کرو... اور وہ لاٹ صاحب ہیں کہ ٹیری کاٹ کے پتلون اور شرٹ پہن کر، ہاتھ میں سیکو گھڑی لگا کر گھومنے سے فرصت نہیں۔ ٹو ان ون، ویڈیو سے دل بہلاتے ہوئے چھ سال سے بی اے کر رہے ہیں.. اور اب تو موبائل کا خرچہ بھی ان کا دینا پڑتا ہے..... اور ابّا.... وہ تو دروازے کے باہر چارپائی ڈالے سعودیہ والے ہونہار بیٹے کی تعریف کرتے ہوئے ملنے والوں کی چائے پلاتے رہتے ہیں۔ ان کو یہ ارمان ہے کے اب دروازے پر بیٹھک کا ایک پکا کمرہ بن جائے ....

میری بیوی زرینہ کو یہ فکر کہ اب تک تو بھائی بہنوں کے لئے کمایا اب اپنے بال بچوں کا بھی تو سوچو۔ ابھی واپس آنے کی بات مت کرنا... یہ سلسلہ دس برس سے ہے... کیوں... کب تک؟ زبیر احمد کون ہے وہاں تمہارا منتظر... کیا جب لوگ سعودی عرب نہیں آتے تھے تو کیا زندہ نہیں رہتے تھے... وہ بڑبڑانے لگا۔

دوپہر کی دھوپ بہت تیز ہوگئی تھی اس کی آنکھوں میں چبھنے لگی تھی۔ اسکول کے بچوں کو اسکول سے لے کر ان کے گھروں کو پہنچا کر وہ جلدی سے کھانے کے لئے مدینہ ہوٹل بھاگا۔ ورنہ عصر کی اذان ہو جاتی ہے تو ہوٹل بند ہو جاتا ہے۔ ہوٹل میں جہاں بہت سے ٹیکسی ڈرائیور روز کھانا کھانے آتے تھے وہیں زبیر کا بھی مہینے بھر کا دونوں وقت کا کھانا بندھا ہوا تھا۔ کون اپنے آپ پکانے کے چکر میں پڑے۔ شروع شروع میں روم پر پکایا جاتا تھا۔ مگر دن بھر تھکنے کے بعد کھانا پکانے کی ہمت ہی نہیں ہوتی تھی۔ آج مدینہ ہوٹل میں کچھ عجب سا ماحول تھا۔ کئی ٹیکسی ڈرائیور اردو نیوز اخبار پر جھکے ہوئے تھے۔ اس نے پشاور والے خان بھائی سے ہنس کر پوچھا۔

"کیا ہوا گل محمد خاں؟ کیا آج تمہارا نام ہے لاٹری کے انعام میں؟"

"نہیں جی، لاٹری نہیں نکلی، اب ہم سب یہاں سے نکلنے والا ہے"۔ اس نے اخبار زبیر کی طرف بڑھا کر کہا۔

اخبار میں بڑی سی سرخی تھی کہ ”سعودی عرب میں غیر ملکی لوگوں کے ٹیکسی چلانے پر پابندی، چھ ماہ کے بعد صرف سعودی شہری ہی ٹیکسی چلائیں گے۔“

زبیر کا دل دھک سے رہ گیا۔...... اگر یہ خبر سچ ہوئی تو کیا ہوگا... گھر والوں کو کیسے بتاؤں گا...... دل نے چپکے سے کہا..... کاش یہ خبر سچ ہو تو کتنا مزہ آئے... گھر کے باہر نیم کی چھاؤں میں چارپائی ڈال کر گرمی کی دوپہریں کاٹی جائیں.... سردیوں میں چارپائی دھوپ میں ڈال کر محلے پڑوس والوں سے باتیں کروں.... ہاں اگر یہ خبر سچ ہو جائے تو.... اس کے دل میں ایک ترنگ سی لہرائی۔

زبیر نے کھانے میں آج اسپیشل قورمے کا آرڈر دیا۔ جو اس کے روز والے کھانے کے پیسوں میں شامل نہیں تھا۔ جم کر کھانا کھایا اور کھانے کے بعد سیدھا روم پر آ کر آرام سے پلنگ پر لیٹ گیا...”اب جو ہو سو ہو“...اس نے خود سے کہا...اور منہ تک چادر تان لی۔ بہت دنوں بعد وہ بالکل بے خبر سویا تھا۔

اس ملبے میں

گھر پر مستقل ٹی دی دیکھ دیکھ کر دماغ اُڑا جا رہا تھا تو میں گاڑی نکال کر یوں ہی بے مقصد سڑکوں پر گھومتا رہا۔ سہ پہر کا وقت مجھے ہمیشہ اداس کر دیتا ہے اور آج تو سارا شہر ہی سائیں سائیں کرتا ہوا لگ رہا تھا۔ سرسبز درختوں سے گھری صاف شفاف سڑکوں پر گھنٹوں گاڑی گھمانے کے بعد نہ جانے کیوں میں اس بار کے سامنے رک گیا جہاں میں اکثر صرف اس لئے آ جاتا تھا کہ ایک دو گھنٹے بالکل تنہا اور خاموش بیٹھا رہوں... لوگوں کی دیکھتا رہوں.... میں کوئی شرابی نہیں ہوں بس کبھی کبھار ایک آدھ بیئر پی لیتا ہوں...

نیم تاریک بار میں آج زیادہ لوگ نہیں تھے تین چار مرد کاونٹر کے سامنے اونچے اسٹولوں پر بیٹھے سامنے گلاس رکھے، مستقل ٹی وی اسکرین پر نگاہیں جمائے ہوئے تھے۔ سی این این پر نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سینٹر کے تباہی کے بعد کے مناظر دکھائے جا رہے تھے۔ بار پر کھڑی لڑکی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا، میں نے ایک بیئر کا آرڈر دیا اور اسٹول گھسیٹ کر کاونٹر کے ایک کنارے بیٹھ گیا۔ ابھی دس دن پہلے اسی بار میں زیادہ تر لوگ بیئر کے گلاس ہاتھ میں لئے ٹی وی پر بیس بال کے میچ دیکھ رہے ہوں گے....اور آج ہر آدمی صرف سی این این دیکھ رہا ہے....ابھی تک وہ ہولناک منظر بار بار دکھایا جا رہا ہے.... کس طرح وہ عظیم الشان ٹاور گتے کے کھلونے کی طرح دہشت سے بیٹھ گئے....ٹی وی پر اب دھول میں اٹے پولس والے اور فائر مین ملبے سے لاشیں نکالنے کی کوشش میں جٹے ہوئے دکھائے جا رہے تھے۔ مجھے پتہ بھی نہیں چلا کہ آنسو میری آنکھوں سے کب بہہ نکلے۔

میرے پاس بیٹھے ادھیڑ عمر کے آدمی نے اپنی ڈرنک ختم کر کے کاؤنٹر پر گلاس رکھا اور

جھک کر مجھ سے پوچھا۔

''کیا تمہارا بھی کوئی عزیز اس ملبے میں دفن ہو گیا ہے؟''

شائد وہ مجھے امریکن ہی سمجھ رہا ہے۔ میں نے بھی اس کی طرح ٹی شرٹ اور جینز ہی تو پہنی ہوئی ہے۔ میرے بہت گورے رنگ کی وجہ سے لوگ مجھے پاکستانی سمجھتے ہی نہیں.... مگر میں تو اب امریکن ہوں.... میں پاکستانی ہوں.... نہیں پچھلے آٹھ سال سے میں امریکن ہوں۔ میرے پاس امریکن پاسپورٹ ہے... پاسپورٹ تو کناڈا کا بھی ہے جو مجھے بائیس سال پہلے مل گیا تھا۔

میری طرف سے جواب نہ پا کر وہ پھر ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ میں نے اپنے مگ میں بچی ساری بیئر حلق میں انڈیل لی اور اشارے سے کاؤنٹر پر کھڑی لڑکی سے ایک اور بیئر کے لئے کہا.... بائیس سال.. نہیں بلکہ تیس سال..... بیس سال کی تو میری بیٹی مریم ہو گی.... کہاں ہو گی مریم... میں خود کہاں ہوں... اس کا نام مریم میں نے اس لئے رکھا تھا تا کہ اس کی ماں کیرول اسے اپنے جیزز کرائسٹ کی کنواری ماں کے نام منسوب سمجھے اور مریم میری دادی کا نام بھی تھا..... مریم، کیرول. دادی اماں اور ٹی وی پر دکھائے جانے والے مناظر سب دماغ میں گڈمڈ ہوئے جارہے ہیں.

شاید میں نے بیئر زیادہ پی لی ہے.... عادت نہیں ہے نا زیادہ پینے کی........ سمیرہ تو یہ ہی سمجھتی ہے کہ میں نے کبھی شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے، وہ تو بہت نمازی پرہیز گار ہے... چلو رضا میاں وہ اسی طرح خوش ہے تو یوں ہی سہی... ہاں کیرول کہا کرتی تھی کہ بیئر شراب تو نہیں ہوتی... کیرول، اونہہ نہ جانے آج کیوں اتنے برسوں بعد یہ سب باتیں یاد آ رہی ہیں جنھیں میں زندگی کی دوڑ میں کہیں بہت پیچھے چھوڑ آیا تھا.... اب اتنے برس بعد امی کے اصرار پر سمیرہ کو کراچی سے شادی کر کے لے آیا ہوں... بے چاری سمیرہ! اسے بھی میں نے کیا دیا ہے...... ابھی چار سال ہی ہوئے اسے یہاں آئے ہوئے ..... بہت شوق ہے اسے بڑا سا مکان خریدنے کا .... بڑا سا مکان تو میں نے مانٹریال میں کیرول کے ساتھ مل کر لیا تھا ... امی کو اس گھر کی تصویریں کھینچ کر بھیجی تھیں تو وہ سب کو کتنے شوق سے دکھاتی تھیں...... اس شوق میں وہ یہ غم بھی بھول جاتی تھیں کہ انکے ہونہار بیٹے نے کناڈا میں کسی گوری سے شادی کر لی ہے۔ ایک ہفتے کے لئے جب ایک بار کیرول کو میں امی سے ملانے کراچی لے گیا تھا تب وہ اپنی ملنے والیوں سے

سرگوشی کرتی تھیں۔

''اسلام قبول کرلیا ہے اس نے ہم نے تو اسکا نام تسلیم رکھا ہے، ہے نا اچھی جوڑی؟ ''تسلیم ورضا''

اوفوہ! کس کس خود فریبی میں ہم سب رہتے ہیں...رضا حسین کیا وہ خود فریبی نہ تھی جب تم نے کیرول سے شادی کی تھی....سچ سچ بتاؤ مقصد تو کناڈا کی امیگریشن لینا تھا نا؟..ٹھیک ہے، مان لیا کہ تم ان بے ضمیر لڑکوں میں سے نہیں ہو جو امگریشن کے لئے گوری لڑکیوں سے شادی کر کے مقصد پورا ہو جانے پر ان لڑکیوں کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینک دیتے ہیں....اور نہ کیرول ہی پیسے لے کر امگریشن دلوانے کے لئے شادی کرنے والی لڑکیوں میں سے تھی....اس کا گھریلو پن ہی تو تمہارے من کو بھایا تھا..ٹھیک ہے تم دونوں کو ایک دوسرے سے محبت تھی...مان لیا بابا مان لیا۔ کیرول نے شادی کے بعد نوکری نہیں کی، اسے بھی پُرسکون کی زندگی کی تلاش تھی۔ کسے شوق ہوتا ہے کڑکڑاتی سردی میں صبح اٹھ کر نوکری پر جانے کا.........

سچ بتانا رضا میاں! تم کیا یہ نہیں چاہتے تھے کہ کیرول اپنی ملازمت برقرار رکھے، تمہارا ہاتھ بٹائے؟ دل پر ہاتھ رکھ کر کہنا۔ سارا معاملہ یہ تھا کہ تم پر اپنے سارے خاندان کی ذمہ داری تھی....اور کیرول کو اپنا سجا سنورا محفوظ گھر چاہیے تھا۔

جب کیرول سے علیحدگی ہوئی تو تم امی کو یہ نہ سمجھا سکے کہ اب یہ مکان بیچنا کیوں ضروری ہو گیا ہے۔ وہ یہ سمجھ نہیں سکتیں تھیں کہ کیرول ان کے بیٹے کی خون پسینے کی کمائی سے خریدے ہوئے مکان کی آدھی حقدار کیوں ہے،......اور کیرول یہ نہیں سمجھ سکتی تھی کہ اس کے میاں کی کمائی میں سے کیوں ہر مہینے اک بڑی رقم پاکستان بھیجنا ضروری ہے؟........کیوں اپنے والد کی سات اولادوں کا بوجھ دور بیٹھے رضا کو اٹھانا ہے....ویسے بات تو ٹھیک ہے آخر کیوں یہ میری ذمہ داری تھی؟...میاں رضا! کیا آج بہت پی گئے ہو...ساری زندگی خاندان کے لئے کما کر دینے کے بعد یہ کیا سوچنے لگے آج......کیرول سے علیحدگی کی بھی تو یہی سب سے بڑی وجہ تھی۔ اور پھر مریم کا مسئلہ تھا........سید امداد حسین کی پوتی اور موسیو آندرے لالوند کی نواسی اگر کسی افریقن لڑکے کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کرتی ہے تو رضا صاحب آپ کیوں ہاتھ ملتے ہیں.....

سامنے بار پر کھڑی بارٹنڈر بھی شاید مریم کی عمر کی ہی ہوگی، اس نے میرا گلاس خالی

دیکھ کر ایک اور بیئر کی بوتل کھول کر میرے سامنے رکھ دی۔

چلو اک بیئر اور پی لی جائے پرانے زخموں کے نام...واہ! رضا میاں آج تو شاعری ہونے لگی....اپنے ابا کی شعروشاعری سے تم کیسا گھبراتے تھے...ابا میاں کا کام بھی اور کیا تھا، دن بھر دفتر میں کلرک کی ڈیوٹی بجائی، شام کو کوئی شاعر نما دوست آ گیا اور نئی غزلیں سنی اور سنائی جارہی ہیں۔یا پیلے کاغذ پر چھپا اپنا خاندانی شجرہ نکال کر بیٹھ گئے، بچوں کو گھیر لیا کہ دیکھو ہمارے خاندان کے جدِّ امجد فلاں صوفی بزرگ فلاں صدی میں،فلاں جگہ سے آئے تھے، ہندوستان میں فلاں جگہ آ کر قیام کیا اوران کے کا مزاراب بھی وہیں ہے....ابا نہ جانے کیا کیا کہتے رہتے...تان آ کر ٹوٹتی کہ کس طرح پاکستان بننے کے بعد وہ کراچی آئے، کیا کیا مصیبتیں اٹھائیں...ان کی لمبی گفتگو سے بور ہو کر ہم بچے اس چکر میں رہتے کہ کب گلی میں جا کر کرکٹ کھیلیں۔ابا ہندوستان میں اپنے آبائی وطن کی مٹی کی یادیں لئے جلد ہی دنیا سے چلے گئے اور اُن کی آٹھ عدد اولادوں کا کیا ہوگا وہ اللہ پر چھوڑ دیا.. .ان سب کے پیلے پیلے چہرے، ضرورتوں کی فہرستیں، بڑھتی مہنگائی...کہیں دور کسی اجنبی برف زار میں ان سب کا مداوا تھا۔

سنا تھا کہ کناڈا کے کسی شہر مانٹریال میں اولمپک گیمس ہو رہے ہیں اسے دیکھنے جانے کے لئے ویزا آسانی سے مل رہا ہے۔امی نے کہیں سے قرض ادھار کر کے مانٹریال جانے کے ٹکٹ کا انتظام کر دیا...زندگی کی دو دہائیاں گذار دیں اس شہر میں جس کا نام کبھی بچپن میں سنا بھی نہیں تھا۔اور اب.........اس شہر میں میری بیٹی بھی کہیں کھوئی ہوئی ہے.....چھ سال سے مریم کی کوئی خبر ہی نہیں ہے...شاید مجھے نیند آ رہی ہے یا کچھ زیادہ پی گیا ہوں...پچھلے تیس برس ویڈیو کیسٹ کی طرح فاسٹ فارورڈ ہوتے ہوئے چند منٹوں میں دماغ میں تیز ریل کر طرح گھوم گئے...ہوٹلوں میں بیرا گیری کی تھی.......... وہیں اک ریستراں میں کیرول سے ملاقات ہوئی، شادی ہوئی اور امگریشن مل گیا تو الکٹریکل انجینیرنگ کا ڈپلوما کام آیا اور پھر کیرول کی چچا کے جان پہچان والی ایک مال بردار جہاز کی کمپنی میں نوکری مل گئی۔کناڈا کا پاسپورٹ بھی مل گیا...پرفیکٹ۔

کیرول سے طلاق کے بعد مجھے مانٹریال چھوڑنا پڑا کیوں کہ وہاں رہتے ہوئے مجھے اسے (alimoney) المونی کی رقم دینی پڑتی۔ویسے بھی اس برف زار میں کیا رکھا تھا...واپس لوٹ کر گھر جانے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا، دو تین سال بعد جب کبھی مہینے بھر کے لئے گھر جاتا

تھا تو وہ ہی مشکل لگتا تھا۔ کناڈا کا پاسپورٹ ہونے کی وجہ سے امریکہ میں آرام سے رہ سکتا ہوں یہ تسلی تھی دل کو... دس برس تو پانی کے جہازوں پر سوار نہ جانے کون کون سی انجانی بستیوں میں وقت گذارا تھا۔ اک خواب تھا کہ کیلی فورنیا جا کر سیٹل ہوں گا، گرم علاقے میں باقی عمر چین سے گذاروں گا...

اس وقت ٹی وی اسکرین پر سمندر میں اک چٹان پر بنا اسٹیچو آف لبرٹی دکھایا جا رہا تھا اور سمندر کے کنارے دور مین ہیٹن سے دھول کا غبار اٹھتا دکھائی دے رہا تھا... میرے برابر بیٹھے ہوئے آدمی نے اپنا گلاس اٹھا کر میرے مگ سے ٹکرا کر جذباتی انداز میں ٹوسٹ کیا۔

"To the statue of liberty"

تھوڑی دور بیٹھا ایک سیاہ فام امریکی جو شاید کافی چڑھا گیا تھا زور زور سے مشہور امریکی گانا گانے لگا۔

It is my land, it is your land , from california to New york Island.

میں نے سوچا تھا کہ اب کیلی فورنیا کو گھر بناؤں گا۔ کیرول سے علیحدگی بھی امریکہ جانے کا بہانہ بن گئی.... کیلی فورنیا اس زمانے میں سلکون ویلی تھا، کیا زور تھا اس زمانے میں کمپیوٹر کا اور اتفاق سے کراچی کا اک پرانا میمن دوست مل گیا جس کی کمپیوٹر چپس کی بزنس تھی میں اس کی کمپنی میں لگ گیا۔ ابھی کئی بہنوں کی شادی کرنی تھی، امی کا اصرار تھا کہ دونوں چھوٹے بھائیوں کو بھی امریکہ بلالوں کیونکہ کراچی کے حالات بہت خراب ہیں...نوجوان لڑکے نہ جانے کیسی کیسی تنظیموں میں شامل ہو رہے ہیں۔ ان سب جھمیلوں میں کیسے سال پہ سال گذرتے رہے کچھ پتہ ہی نہیں چلا...

اب ان سب ذمہ داریوں سے فرصت ملی تھی، امریکہ کا بھی پاسپورٹ مل گیا تھا۔ دونوں بھائی اپنے اپنے دھندوں میں لگ گئے تھے، ان دونوں کی دلہنیں پاکستان سے لے آکر دیکھتے دیکھتے ہی امریکہ میں رچ بس گئیں تو امی کی پرانی ضد نے زور پکڑ لیا اور انھوں نے سمیرہ سے میری شادی کرادی... ورنہ گھر داری کا شوق تو اب کچھ باقی نہیں رہا تھا۔ امی شاید ٹھیک ہی کہتی تھیں کہ اب بڑھاپے کے لئے کوئی انتظام کرلے، کب تک یوں ہی اکیلا گھومتا رہے گا۔ شکر ہے

کہ یمیرہ بھی اچھی خاصی عمر کی سیدھی سادھی سی عورت مل گئی ...وہ آئی تو پھر سے اپنی زندگی کے بارے میں سوچنا پڑا۔ بس سوچا تھا کہ نوکری کرتے کرتے تھک گیا ہوں، اتنی رقم جمع کر لی ہے کہ اپنا کوئی چھوٹا سا اسٹور یا بزنس کرلوں اور زندگی کے دن آرام سے کاٹ دوں۔ بس اب کیا چاہیے؟ دو وقت کی روٹی اور سکون کی نیند اور ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ۔

اک زوردار چھناکا ہوا شاید بارٹینڈر کے ہاتھ سے صاف کرتے کرتے اک گلاس گر گیا... پاس بیٹھے ہوئے آدمی نے کہا

"Take it easy"

یہی مجھ سے میرے میکسیکن پڑوسی نے بھی کہا تھا جب دو دن پہلے میری منی سپر مارکیٹ پر کچھ نوجوان گورے لڑکوں نے حملہ کر دیا تھا اور توڑ پھوڑ مچائی تھی۔ میرا پڑوسی کہتا تھا کہ کیوں فکر کرتے ہو انشورنس تو تمہاری ہے نا... اپنی ساری جمع پونجی جمع کر کے ابھی چھ مہینے ہی تو ہوئے تھے میں نے یہ منی سپر مارکٹ خریدی تھی... اس سے گذر بسر تو اچھی خاصی ہو ہی جاتی .... چلو جیسی بھی زندگی ہے کم سے کم پاکستان سے تو بہتر ہوگی۔ نلوں میں پانی آتا ہے۔ بجلی ہمیشہ رہتی ہے۔ دنگے نہیں ہوتے، کوئی خواہ مخواہ گولی مارتا ہوا موٹر سائیکل پر زن سے نہیں نکل جاتا..... مگر یہ کیا ہوا... گیارہ ستمبر نے تو سب کچھ بدل کر رکھ دیا... ہر طرف نفرت کی نگاہیں...... حالانکہ مجھے یہ خوش فہمی تھی کہ میرا گورا رنگ اور میرا امریکی لہجہ میرا پردہ بن جائے گا۔ کیلی فورنیا میں اکثر لوگ مجھے میکسیکن سمجھتے تھے.... میں نے کبھی سیاست سے سروکار ہی نہیں رکھا تھا... زندگی کی گاڑی کھینچنے میں کبھی فرصت ہی نہیں ملی کہ کچھ سوچوں...

ہاں، یاد آیا جب ایران میں امریکنوں کو یرغمال بنایا گیا تھا تب میں کناڈا میں تھا، میرے نام میں رضا ہونے کی وجہ سے کیرول مذاق میں کہتی تھی کہ تم کو ایرانی سمجھ کر کوئی پیٹ نہ دے میں ہنس کر کہتا تھا کہ کیوں مجھے تم ایران کا معزول بادشاہ رضا کیوں نہیں سمجھ سکتیں۔

جب گلف وار ہوئی تھی تب میرے نام میں حسین ہونے کی وجہ سے میرے امریکن ساتھی مذاق میں مجھے صدام حسین کہہ کر چڑاتے تھے... میں ہنس کر ان سے کہتا کہ چلو میں اپنا نام بدلے لیتا ہوں رضا ہیوسن رکھے لیتا ہوں۔ ویسے پہلے ہی رضا الحسنین سے میں رضا حسین ہو گیا تھا کیوں کہ ان لوگوں کی زبان سے اس نام کی ادائیگی مشکل تھی۔ کیرول اور دوسرے لوگ تو riz کہہ

کر کام چلاتے لیتے ہیں....تو جناب رز صاحب... پرانے رضا الحسنین سے اب تک آپ کا کیا تعلق تھا؟...بس اتنا ہی نا کہ جب کوئی مسجد کے لئے چندہ لینے آتا ہے تو دے دیتے ہو۔

مگر اس بار تو رضا حسین سے کوئی مذاق بھی نہیں کر رہا ہے....ٹورانٹو کی طرح پاکی کہہ کہ چڑا بھی نہیں رہا....بس نگاہوں میں نفرت ہے، کہتے ہیں واپس جاؤ اپنے اسامہ بن لادن کے پاس...ارے بھیا! وہ کون سا میرا سگا ہے... اور اللہ جانے حقیقت میں کوئی اسامہ ہے بھی کہ نہیں۔

میرے ساتھ بیٹھا ہوا امریکی مجھ سے مخاطب تھا....کیا تمہارا بھی کوئی عزیز اس ملبے میں دفن ہو گیا ہے؟''

مجھے اپنی آواز کہیں بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی....

''اس ملبے میں خود میں اپنے تین پاسپورٹوں سمیت دفن ہو گیا ہوں''۔

انتم سنسکار

ڈیوڑھی نما بڑے دروازے میں داخل ہو کر بیری والا باغ محلہ شروع ہوتا تھا جہاں پھوپی جان کا گھر تھا۔ دروازے سے داخل ہوتے ہی بیچ کی نسبتاً چوڑی گلی سے دائیں بائیں پتلی پتلی گلیاں نکلتی تھیں جہاں پرانے مکان تھے جو مسلمان پاکستان جاتے وقت چھوڑ گئے تھے اور ان میں مغربی پنجاب سے آئے ہوئے خاندان بس گئے تھے۔ لیکن اب بھی اس محلے میں کچھ مسلمان خاندان آباد تھے۔ پھوپھا جو شفیق میموریل اسکول میں استاد تھے انھوں نے شاید سن اڑتالیس میں یہ مکان کرائے پر لیا تھا۔ نہ جانے کس سے لیا ہوگا، میں گھر میں داخل ہوتے ہوئے سوچنے لگی۔

پھوپی جان کے گھر کا آنگن ہمیشہ کی طرح صاف ستھرا تھا۔ حالانکہ فرش کے پرانے سرخ پتھر کئی جگہ ٹوٹ گئے تھے۔ آنگن میں دروازے کے ساتھ باہر والی بیٹھک تھی جس کے دو دروازے باہر گلی میں کھلتے تھے اور ایک دروازہ اندر گھر میں کھلتا تھا۔ بیٹھک کے پرانے لکڑی کے کواڑوں کے اوپری حصے میں رنگ برنگے شیشے لگے ہوئے تھا جن میں کچھ ٹوٹ گئے تھے اور ان کی جگہ پلائی کے ٹکڑے جڑ دئے گئے تھے۔ آنگن کے اس پار بیٹھک کے مقابل لمبا برآمدہ تھا۔ برآمدے کے بعد لمبی سہ دری تھی جس کو ایک اینٹ کی دیوار سے کمروں کی شکل دے دی گئی تھی۔ ایک زینہ آنگن سے اوپر جاتا تھا جہاں پھوپی جان کے بیٹے اکبر بھائی رہتے تھے جو ہندو کالج میں زولوجی ڈیپارٹمنٹ میں لکچرر تھے۔

''آداب پھوپھی جان'' میں نے آنگن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

''ارے آج میرا دل کہہ رہا تھا کہ کوئی آئے گا ضرور۔'' انھوں نے مجھے گلے لگاتے ہوئے کہا، ''بے مروت، آگئی پھوپھی کی یاد۔ دلّی میں ہی رہتی ہو اور مہینوں ہو جاتے ہیں شکل دیکھے

ہوئے۔"

"کون آیا ہے بتول" کمرے کے اندر سے دادابا کی بھاری آواز آئی۔ چق اٹھا کر اندر گئی تو وہ حسب معمول تخت پر سفید گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے سفید ململ کا کرتا اور سفید آڑا پاجامہ پہنے۔ سرہانے نہج البلاغہ، دیوانِ میر، چند اور کتابیں اور اردو کا اخبار رکھا ہوا تھا۔

"تصویر زہرا آئی ہے بابا۔" پھوپی جان نے اونچی آواز میں کہا کیونکہ دادا بہت اونچا سننے لگے تھے۔ میرا پورا نام تو صرف پھوپی جان ہی لیتی ہیں۔ ورنہ سب تصویر کہتے ہیں یا یونیورسٹی میں زہرا کہلاتی ہوں۔ دادابا نے میری تاریخ پیدائش کے حساب سے یہ نام رکھا تھا۔

پھوپی جان نے پھر قدرے نیچی آواز میں کہا، "اے ہے! ابھی امام کا چہلم بھی نہ ہوا اور تم نے لال ساڑی پہن لی۔ اور پھر یہ ساڑھی پہننے کہ کیا آفت ہے۔ بن بیاہی لڑکیاں نہیں اچھی لگتیں ساڑی پہنے، ویسے بھی غیروں کا پہناوا ہے"

کہاں تو دادا جان اونچا سنتے ہیں کہاں انھوں نے سب کچھ سن لیا۔ ٹھنڈی سانس بھر کر کہا۔

وہ شکست خوردہ شاہیں جو پلا ہو کرگسوں میں ....

محلے میں داخل ہوتے ہی میں نے ماتھے کی بندی تو اتار کر پرس میں رکھ لی تھی۔ ویسے ہی شوق میں لگالی تھی ساڑی سے میچ کرتی ہوئی بندی۔ اور یہ ساڑی لال بھی تو نہیں، کافی گہری عنابی ہے..... میں نے سوچا۔ دراصل میں سیدھی ایک سیمنار سے ادھر آ گئی جو حقوق نسواں اور اقلیتوں کے موضوع پر جامعہ ملیہ اسلامیہ میں کیا گیا تھا۔

پھوپا جان جو اسکول سے آ گئے تھے اور پلنگ پر بیٹھے جوتے کے فیتے کھول رہے تھے۔ انھوں نے بھی پھوپھو کے اعتراض سن لئے، وہ ہنس کر بولے۔

"تصویر، تمہاری پھوپی جان کا بس چلے تو سارے سال سوگ منایا کریں۔ ڈھائی مہینے محرم، چہلم کا سوگ اور پھر رمضان کے مہینے بھر بھی کوئی ریڈیو یا ٹی وی پر گانا نہیں سن سکتا۔"

"اچھا بس اپنی کامریڈی مت بگھاریے، میں اپنی بیٹی سے بات کر رہی ہوں"۔

پھوپھو کہتی ہوئی کھانا نکالنے چل دیں۔

کوفتے پکے تھے، کھانا کھا کر مزہ آ گیا، ورنہ ہاسٹل میں تو دال، سبزی ہی کھاتی تھی۔ نان ویجیٹیرین اس لئے نہیں لیتی تھی کہ پتہ نہیں گوشت حلال ہے یا جھٹکے کا۔

کھانا کھا کر برآمدے میں بچھی مسہری پر پھوپی جان کے ساتھ لیٹ کر باتیں کرنے لگی تو کچھ دیر کیلیئے آنکھ لگ گئی ہوگی۔ کسی کے زور زور سے بولنے کی آواز سے آنکھ کھلی تو دیکھا اوپر کوٹھے والے مکان سے شکنتلا بہن جی اپنی دیوار پر سر نکالے پھوپی جان سے پوچھ رہی تھیں۔

''بتول بہن جی! تصویر آئی ہے؟اس کی آواز جیسی لگ رہی تھی۔ پنکی بھی آج سسرال سے آئی ہے، پوچھ رہی تھی اپنی بچپن کی سہیلی کو۔اتنی دیر میں پنکی بھی دیوار سے جھانکنے لگی۔ پھوپی جان نے چلا کر کہا۔

''اے ہے! پنکی کیا کرتی ہو، ایسی حالت میں تم کیوں اسٹول پر چڑھ گئیں... یا علی! یا علی، سنبھل کے...اترو نیچے... میں تصویر کو بھیج دوں گی دومنٹ کے لئے تمہارے گھر۔''

مجھے ہنسی آگئی اس دومنٹ والی بات پر۔ جب ہم بچپن میں پھوپی جان کے گھر کبھی چھٹیوں میں جاتے تھے اور پنکی کے گھر کھیلنے کے لئے جانا چاہتے تھے تو پھوپی بس تھوڑی دیر کی اجازت دیتی تھیں۔ کچھ کھانے پینے کی ممانعت کر دیتی تھیں مگر مانتا کون تھا۔ شکنتلا بہن جی کے ہاتھ کے مولی کے پراٹھے کون چھوڑ سکتا ہے۔ کونڈوں کے نیاز کی میٹھی ٹکیاں جب پھوپی جان آنگن میں انگیٹھی رکھ کر پکاتیں تو بے بی اور پنکی میرے ساتھ اکڑوں بیٹھ کر بہت دلچسپی سے دیکھتی تھیں۔ پھوپی جان کو فکر لگی رہتی کہ کہیں وہ ان کے پاک کیئے ہوئے برتنوں کو نہ چھولیں۔ نیاز سے پہلے وہ کچھ پوریاں پنکی اور بے بی کو بھی دیتی تھیں۔

میں پنکی سے بات ہی کر رہی تھی کہ اکبر بھائی گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے، انھوں نے پھوپھا کو الگ لے جا کر کچھ کہا، وہ سر پکڑ کر آنگن میں رکھی نماز کی چوکی پر بیٹھ گئے۔ پھر انھوں نے پھوپی جان سے کچھ کہا تو وہ سینے پر دوہتڑ مار کر مسہری پر گر پڑیں۔ دادا جان باہر نکل آئے تو اکبر بھائی نے رک رک کر بتایا کہ نسیمہ پھوپھی کا فون آیا تھا، ان کی بیٹی سیما جو دلی کے ایک NGO میں سوشل ورکر تھی وہ ایکسیڈنٹ میں ختم ہوگئی۔ اس کی آخری رسومات یہیں ادا ہوں گی۔

نسیمہ پھوپھی ہمارے ابا کی خالہ زاد بہن تھیں۔ اپنے زمانے میں بہت انقلابی تھیں، لکھنؤ میں پڑھتی تھیں تب انھوں نے اپنے ایک کامریڈ ساتھی امریش سنگھ سے شادی کی تھی۔ سیما سے میں دو سال پہلے ملی تھی، وہ مجھ سے دو چار سال بڑی ہوگی۔ بہت پیاری لڑکی تھی، بہت شوق سے سوشل ورک میں ڈپلوما لیا تھا اور اب جی جان سے اپنے کام میں لگی رہتی تھی۔ سیما اپنی ایک

دوست دیپالی کے ساتھ ایک کرائے کے فلیٹ میں رہتی تھی۔ جب سیما کو دہلی میں ملازمت ملی تھی تب نسیمہ پھوپی ایک بار پھوپی جان کے گھر اس کو ساتھ لے کر آئیں تھیں اور اس کو تاکید کی تھی کہ وہ یہاں آتی رہے۔ وہ پھوپھا سے کہہ گئی تھیں کہ سیما کی خیر خبر رکھیں۔

اکبر بھائی اور پھوپھا عجلت سے باہر نکل گئے، پھوپھی کچن کے برابر والے چھوٹے کمرے کا سامان نکالنے لگیں اور مجھے بھی مدد کیلئے بلا لیا، اس کمرے میں غسل دینا تھا۔ مغرب کے وقت سے گھر میں خواتین اور باہر بیٹھک میں مرد آنے شروع ہو گئے۔ پھوپھا، سفید کپڑے کا پلندہ اور اور دیگر سامان پھوپھو کو دینے گھر میں آئے تو بتایا کہ نسیمہ پھوپھو لاش کے ساتھ ایک گھنٹے بعد پہنچ جائیں گی وہ صبح ہی لکھنؤ سے آ چکی ہیں۔

امریش انکل کا انتقال ہوئے دس برس گذر گئے تھے اور ان کا بیٹا امریکہ جا کر بس گیا۔ نسیمہ پھوپی لکھنؤ میں اپنے آبائی مکان میں اپنے ایک بھتیجے کے ساتھ رہتی ہیں وہ بھی دو برس سے سعودی عرب گیا ہوا ہے۔ لکھنؤ میں وہ آج کل بالکل اکیلی ہیں۔ یہ سب تفصیلات پھوپھی نے سامان ادھر اُدھر کرتے ہوئے مجھے بتائی تھیں۔

میں زندگی میں پہلی بار یہ سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ پھوپھو چٹائی بچھا کر کچھ خواتین کے ساتھ کفن تیار کرنے لگیں۔ قریب کی مسجد سے سیپاروں کا بکسا منگوالیا گیا تھا۔ کچھ محلے والیاں آ گئی تھیں، برآمدے میں دری اور چاندنی بچھا دی گئی تھی۔ ایک بزرگ خاتون جو ہاتھ میں تسبیح لئے بیٹھی تھیں، انھوں نے قریب بیٹھی مسز تقوی سے کہا

''سنا ہے کہ مرنے والی کا باپ ہندو تھا، وہ بھی ہندو ہی ہوگی؟''

مسز تقوی نے منہ بنا کر دھیرے سے کہا'' ارے، ان لوگوں کا کیا مذہب، ماں ٹینی باپ کلنگ، بچے اپنے اپنے رنگ۔''

ایک اور خاتون نے سیپارے کا ورق پلٹتے ہوئے کہا '' ہم تو بس مغفرت کی دعا کر رہے ہیں، آگے اللہ جانے۔''

نسیمہ پھوپھو جو گٹھیا کی مریض تھیں، سکتے کی حالت میں دروازے میں داخل ہوئیں، ان کے پیچھے لاش لیکر اکبر بھائی اور کچھ لوگ تھے۔

پھوپی جان نے انھیں سنبھالا اور کچھ خواتین نے غسل دینے کی تیاری شروع کر دی۔

ابھی غسل ختم بھی نہیں ہوا تھا کہ اچانک باہر بیٹھک میں کچھ ہل چل سی ہوئی، کچھ تیز تیز آوازیں سنائی دیں۔

شمشان گھاٹ......ارتھی..... انتم سنسکار........کچھ ایسے الفاظ سنائی دیئے۔

پھوپھا گھبرائے ہوئے اندر آئے اور دھیرے سے پھوپی جان سے کہا کہ سیما کے ددھیال والے آئے ہیں۔ خواتین میں بے چینی سی پھیل گئی۔ نسیمہ پھوپی تو بالکل سکتے کی حالت میں تھیں۔ پھوپی جان دل پکڑ کا بیٹھ گئیں۔

غسل مکمل ہو چکا تھا، آنگن میں میت لا کر رکھی جا رہی تھی، کافور کی بو پھیلی ہوئی تھی، نسیمہ پھوپی پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھیں۔ باہر مردانے میں اب بھی تیز تیز بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اتنے میں ایک لڑکی تیزی سے اندر آئی، یہ دیپالی تھی سیما کی دوست، اکبر بھائی نے بتایا تھا۔ اس کے ہاتھ میں کچھ کاغذات تھے جو اس نے پھوپھا کے ہاتھ میں تھما دیئے۔ پھوپھا نے چند منٹ کاغذات دیکھے، چند منٹ کے لئے آنکھیں بند کر کے کھڑے رہے پھر گہری سانس لے کر کہا ''سیما نے اپنی ڈیڈ باڈی میڈیکل ریسرچ کیلئے دینے کا فیصلہ کئی سال پہلے ہی کر لیا تھا۔''

نسیمہ خالہ چیخ مار کر روئیں، سیما کی لاش سے لپٹ کر اسے چومنے لگیں۔

میں نے نہ جانے کیوں چین کا سانس لیا۔

☆☆

آسمان میں کھڑکی

زہرہ! زہرہ! دونوں وقت مل رہے ہیں نیچے آؤ! کیسی باتیں ہیں تم لوگوں کی جو ختم ہی نہیں ہوتیں، دن میں کالج میں دونوں ساتھ رہتی ہو مگر پھر بھی نجمہ کے ساتھ گھنٹوں چھت پر ٹہل ٹہل کر باتیں کرنا ضروری ہے'' دادی کی آواز آئی۔

دادی کی آواز سے میری آنکھ کھل گئی۔ لیکن نہ وہ مظفر نگر والا گھر تھا..... نہ دادی...، نہ اپنی دوست نجمہ کے ساتھ چھت پر ٹہلنا۔ توبہ ہے! ذرا سی دیر کے لئے بھی آنکھ لگ جائے تو نہ جانے کہاں کہاں کے بھولے بسرے منظر خواب بن کر یوں چلے آتے ہیں جیسے کل کی بات ہو..... میں نے آنکھیں ملتے ہوئے چاروں طرف دیکھا، لگتا ہے کہ مغرب کی نماز کے بعد یونہی ذرا لیٹ گئی تھی تو شاید آنکھ لگ گئی ہوگی۔

میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ میرے اس کمرے کی کھڑکی سے بس مٹھی بھر آسمان نظر آتا ہے، باہر نظر ڈالی تو اُداس سی شام رخصت ہو رہی تھی، لمبی رات اپنی آمد سے مجھے ڈرا رہی تھی، بے خوابی کا عجب مرض پیچھے لگ گیا ہے۔ ایک اونچی سی بلڈنگ کی چھٹی منزل ہی پر یہ فلیٹ ہے جس کی پشت پر یہ چھوٹا سا کمرہ مجھے ملا ہے، جس کی کھڑکی کے سامنے بالکل قریب ہی ایک اونچی بلڈنگ کھڑی میرا منہ چڑاتی ہے جس کے فلیٹوں کی بالکنیوں کو بھی لوگوں نے لوہے کا جنگلہ لگا کر بند کر دیا ہے، بس یہ مٹھی بھر آسمان میرا ساتھی ہے۔

یادوں نے پھر سے مجھے گھیر لیا..... بچپن سے جوانی تک دادی اماں اور میں ایک کمرے میں رہتے تھے۔ ایک پورا کمرہ طاہر بھائی کے قبضے میں تھا۔ میرا دل چاہتا تھا کہ رات دیر تک لیٹ کر ناول پڑھوں لیکن دادی کی نیند خراب ہونے کے ڈر سے نہیں پڑھ سکتی تھی، اپنے

چھوٹے سے ٹرانسسٹر پر گانے سننے کا تو سوال ہی نہیں تھا، اور پھر رات بھر انکے خراٹے۔ صبح وہ فجر کی نماز سے بہت پہلے جاگ جاتی تھیں اور نہ جانے کیا سٹر پٹر کرتی رہتی تھیں۔ امتحانوں کے زمانے میں جب مجھے دیر تک پڑھنا ہوتا تھا تب کمرے کے دروازے کے سامنے ہی برآمدے میں تخت پر بیٹھ کر پڑھتی تھی۔ جی چاہتا تھا کہ بڑے کمرے میں صوفے پر آرام سے لیٹ کر پڑھوں مگر امی کہتی تھیں کہ دادی کمرے میں اکیلی ہوں گی، رات کو باتھ روم جانے کے لئے اٹھیں گی تو تم ساتھ چلی جانا ورنہ کہیں گر پڑ گئیں اور کوئی ہڈی وڈی توڑ بیٹھیں تو اور مصیبت آجائے گی۔ جب ہماری کوئی پھوپھی دادی سے ملنے آتی تھیں تو ان کا ڈیرہ بھی میرے ہی کمرے میں ہوتا تھا۔ میں بدھ کی شام ریڈیو سیلون سے اپنا پسندیدہ پروگرام 'بنا کا گیت مالا' سننے کے لئے ٹرانسسٹر لے کر چھت پر جا کر سنتی تھی، مگر تب بھی دادی مستقل پکارتی رہتی تھیں۔

کتنا دل چاہتا تھا ایک میرا اپنا کمرہ ہو.... صرف میرا..... بلا شرکتِ غیرے۔ اس کی تنہائی، اس کی خاموشی بس میرے لئے ہو، جب تک چاہوں جاگوں، لیٹ کر اپنی پسند کی کتابیں پڑھوں اپنے پسند کے گانے سنوں.... افوہ! نہ جانے یہ اتنی پرانی یادیں کیسے یوں چلی آتی ہیں جیسے کل کی بات ہو۔ شادی کے بعد، بچوں کی پیدائش اور پرورش کے زمانے میں بھی اکثر یہ خواہش جاگ اٹھتی تھی.... میں ہوں اور میرا کمرہ ہو.... کسی کی دخل اندازی نہ ہو۔

میری بہو کی آواز نے مجھے یادوں سے حقیقت کی دنیا میں لا پہنچایا۔ وہ میری پوتی سارہ کو ڈانٹ رہی تھی "کیا ہر وقت کمپیوٹر پر چیٹنگ کرتی رہتی ہو۔ باہر نکلو، لو یہ کھانے کی ٹرے دادی کے کمرے میں لے جاؤ، ان کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے، پھر ان کو دوا بھی کھانی ہوتی ہے۔"

میں سوچتی رہی جیسے یاد اور خواب پل بھر میں کہیں سے کہیں پہنچا دیتے ہیں اس سرعت سے زندگی بھی گذر گئی۔ شادی، بچوں کی پرورش، بیٹیاں اپنے اپنے گھر کی ہو گئیں بلکہ کہنا چاہئے پردیس کی ہو گئیں۔ ایک کناڈا میں دوسری دبئی میں۔ وہ تو کہو کہ شوکت میاں کی بہت اچھی ملازمت ہے ہندوستان میں اس لئے بڑھاپے میں اس کا ساتھ ہے۔ اپنا چھوٹا سا گھر ہمارے میاں نے بنایا تھا بریلی میں جہاں وہ کالج میں پڑھاتے تھے۔ دل تو چاہتا تھا کہ ان کے بعد ان کی یادوں کیساتھ وہیں رہوں مگر بیچارہ شوکت میرے لئے پریشان رہتا تھا، اس کی ملازمت دہلی میں تھی، اس لئے وہ بریلی والا گھر بیچ کر مجھے اپنے ساتھ دہلی لے آیا۔ اللہ اسے خوش رکھے میرا ہر

طرح خیال رکھتا ہے، اور بہو بھی بُری نہیں ہے۔ میرے آرام اور کھانے پینے اور دوا علاج کا سب بہت خیال رکھتے ہیں۔

ہاں! اس گھر میرا ایک کمرہ ہے... گھر؟ اسے گھر نہیں کہا جا سکتا، گھر تو دالان اور صحن والا ہوتا ہے، یہ تو فلیٹ ہے، جی ہاں اس فلیٹ میں میرا ایک کمرہ ہے، بلا شرکتِ غیرے۔ وہی کمرہ جس کھڑکی سے بس مٹھی بھر آسمان نظر آتا ہے۔ برابر والا بڑا کمرہ میری پوتی سارہ کا ہے، ایک چھوٹا سا کمرہ پوتے شارق کا ہے اور بڑا کمرہ بیٹے بہو کا۔ فلیٹ کی بالکنی میں بھی دوسرے فلیٹوں کی طرح لوہے کی جالی لگا دی گئی ہے، چوری چکاری کے ڈر سے، حالانکہ ہم چھٹی منزل پر رہتے ہیں۔

مجھے یہاں آئے ہوئے تقریباً ایک سال ہو گیا ہے۔ سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں۔ میں اپنے کمرے میں لیٹی کافی دیر پڑھتی رہتی ہوں......... کتنی دیر پڑھوں.... آنکھیں بھی اب جواب دے رہی ہیں۔ یہاں اردو کے رسالے اور کتابیں بھی مشکل سے ملتی ہیں اور انگلش پڑھنے میں اتنی روانی نہیں ہے۔ دن میں جب بچے اسکول کالج میں ہوتے ہیں، کچھ دیر باہر نکل کر بیٹھ جاتی ہوں۔ بہو سے کہتی ہوں کہ لاؤ سبزی کاٹ دوں مگر وہ کہتی ہے امّی رہنے دیں خواہ مخواہ یہاں کوڑا ہوگا۔ بہو کو گھر سجانے اور صاف رکھنے کا جنون ہے، میوزیم جیسا گھر ہے۔ لاؤنج میں کوئی کشن ادھر سے ادھر ہو گیا تو آفت آ جاتی ہے۔ ایک دیوان جو لاونج میں پڑا ہے اس پر بہو لیٹ کر دوپہر میں اپنے ٹی وی ڈرامے دیکھتی ہے۔ مجھے اندازہ ہے کہ میں زیادہ دیر لاونج میں لیٹ یا بیٹھ جاتی ہوں تو بہو کچھ الجھ سی جاتی ہے حالانکہ زبان سے تو کچھ نہیں کہتی۔ شام چار بجے سے پوتے شارق کے کارٹون شروع ہو جاتے ہیں اور لاونج پر ان کا قبضہ ہو جاتا ہے میں اس کے ساتھ بیٹھ کر کبھی کبھی کارٹون دیکھ لیتی ہوں۔ اب تو ٹام اور جیری سے بھی جان پہچان ہو گئی ہے۔ رات کو شوکت اپنے پروگرام دیکھتے ہیں، اب تو عجیب عجیب قسم کے پروگرام اور اشتہار ٹی وی پر آتے ہیں۔ بیٹے بہو کے ساتھ بیٹھ کر دیکھنے میں شرم آتی ہے اور جب کبھی اکیلی ہوتی ہوں تو ان کمبخت کئی قسم کے ٹی وی کے ریموٹوں کا کون سا بٹن دباؤں سمجھ میں نہیں آتا۔ بہو کو بار بار پکارنا اچھا نہیں لگتا۔

مجھے یاد ہے کہ میری ساس برآمدے میں پلنگ ڈال کر بیٹھتی تھیں جہاں سے آنگن کے دروازے پر اور باورچی خانے پر نظر رہ سکے۔ گھر میں کون آیا کون گیا ہر بات کی فکر رہتی

تھی۔دروازے کی گھنٹی بجی تو پوچھنا ضروری تھا کہ کون آیا ہے۔کبھی کبھی میں اور بچے بھی الجھتے تھے۔

یہاں شوکت کے ہاں دن میں ایک عورت جھاڑو پونچھا کرنے آتی ہے اور ایک برتن دھونے،دونوں جلدی جلدی اپنا کام ختم کر کے چلتی جاتی ہیں،بلڈنگ کے اور گھروں میں بھی کام کرنا ہوتا ہے۔یہ کوئی مظفر نگر یا بریلی نہیں جہاں جمعدارن اور گھر میں کام کرنے والی بوائیں پان کھانے کے بہانے دیر تک بیٹھی باتیں بناتی رہتی تھیں۔یہ تو نیا فیشن ایبل علاقہ ہے نوئیڈا۔یہاں یوں کوئی کسی کے گھر منہ اُٹھائے نہیں چلا آتا۔شہر میں جرم بھی بڑھ گئے ہیں،ہر وقت دروازے مقفل رہتے ہیں۔جی چاہتا ہے کہ روز باہر نکل کر ٹہل آؤں،مگر لفٹ میں اکیلے آتے جاتے ڈر لگتا ہے،چھ منزل سیڑھیاں چڑھنا تو اب میرے بس کی بات نہیں۔

میں عشاء کی نماز پڑھی رہی تھی سارہ کھانے کی ٹرے کمرے میں رکھ کر چلی گئی۔باہر لاونج میں شوکت ٹی وی پر کوئی سیاسی تبصرہ سن رہے تھے،بہو کچن میں تھیں۔ڈائننگ ٹیبل پر،پوتا اپنے اسکول کا کوئی پراجکٹ بنا رہا تھا۔سامان بکھرا ہوا تھا ورنہ میرا دل چاہ رہا تھا کہ باہر بیٹھ کر کھانا کھاؤں۔لیکن کمرے میں بیٹھ کر ہی کھالیا۔کھانا کھانے کو جی تو نہیں چاہ رہا تھا مگر دوا کھانی تھی اس لئے کچھ تو کھانا ہی پڑا۔سوچا ٹرے اٹھا کر کچن میں رکھ دوں،کمرے سے نکلی تو پائیدان میں پاؤں الجھ گیا اور ٹرے گر گئی۔شکر ہے کہ میں نہیں گری ورنہ کوئی ہڈی ٹوٹ جاتی تو اور لینے کے دینے پڑ جاتے۔ہنگامہ سا ہو گیا،شوکت گھبرا کر اٹھا"اماں،کیوں آپ کام کرتی ہیں،کوئی ٹرے نے جاتا"،بہو دوڑی آئی،سارہ کو سخت ڈانٹ پڑی۔میں چور سی بن کر کمرے میں چلی گئی۔

مجھے رات کو نیند ویسے بھی کم آتی ہے،آج تو نیند کی گولی کھانے کے بعد بھی غائب تھی۔ بس وحشت سی ہوئی تو باہر لاونج میں نکل آئی،سب سونے چلے گئے تھے۔صرف سارہ کے کمرے میں لائٹ جل رہی تھی۔سوچا بے چاری بچی کو میری وجہ سے ڈانٹ پڑ گئی،جا کر اس سے بات کروں،ڈرتے ڈرتے اس کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گئی۔حسب معمول وہ اپنے کمپیوٹر کے سامنے بیٹھی تھی۔

"کیا بات ہے دادی! کچھ چاہئے"وہ بہت ملائمت سے بولی۔میں سوچ رہی تھی کہ

اس کا منہ پھولا ہوا ہوگا یا وہ سمجھے گی کہ میں اس کی ٹوہ لے رہی ہوں، کہیں چڑ نہ جائے۔اس کے لہجے نے میری ہمت بڑھائی، میں اس کے پلنگ پر بیٹھ گئی۔ کمرے کا جائزہ لیا صاف ستھرا، سجا بنا کمرہ، کبھی میں نے غور سے دیکھا ہی نہیں تھا۔

''سارہ بیٹی! سوری تمھیں میری وجہ سے ڈانٹ پڑ گئی۔''میں نے کہا۔

سارہ بولی ''دادی! آپ سوری کیوں کہہ رہی ہیں، میری غلطی تھی''

میں مزید حیران ہوئی یہ سارہ ہے جس کی کھڑم کھڑم قسم کا انگریزی بولنے کا لہجہ مجھے بہت گستاخ لگتا تھا۔میری ہمت بندھی، میں نے پوچھا

''کیا کرتی رہتی ہو کمپیوٹر پر ہر وقت''میں نے پوچھا۔

اس نے بہت تمیز سے جواب دیا ''اس وقت تو میں فیس بک پر ہوں۔ کناڈا والی سیمیں پھوپی کی بیٹی امبرین کا میسج پڑھ رہی ہوں۔روز اس سے بات ہوتی ہے''۔

روز؟ میری بیٹی تو مجھ سے مہینے میں بس ایک آدھ بار فون پر بات کرلیتی ہے، میں نے سوچا۔

سارہ اپنی کرسی چھوڑ کر کھڑی ہوگئی، مجھے اس پر بٹھا دیا'' آیئے دیکھیے، اتنے سارے فوٹو ہیں۔امبرین کی برتھ ڈے تھی۔ گھر پر بڑی سی پارٹی تھی، رکیئے میں دبئ والی پھوپی نسرین کے بیٹے کی تصویریں بھی دکھاتی ہوں۔''

''بیٹی میرا پڑھنے کا چشمہ نہیں ہے''میں نے کہا۔

''ویٹ اے منٹ wait a minute ! دادی کہاں ہوگا آپ کا چشمہ، سائیڈ ٹیبل پر نا، دواؤں کے ڈبے کے پاس نا''

وہ دوڑ کر میرا چشمہ لے بھی آئی۔ وہ ایک ایک کر کے تصاویر دکھا رہی تھی، سب کے نام بتاتی جا رہی تھی، یہ دیکھئے آپ کی پاکستان والی کزن کے بیٹی اور بہو، وہ بھی ٹورانٹو میں رہتے ہیں، یہ ان کے فیملی فرینڈ ہیں۔''

وقت کا پتہ ہی نہیں چلا، میں کسی اور ہی دنیا میں گھوم رہی تھی، سارے بچھڑے لوگ یوں روبرو تھے۔

''اوہ! آپ کا تو اب سونے کا وقت ہوگیا'' سارہ نے گھڑی کی طرف دیکھ کر کہا۔

اسے کیا معلوم تھا کہ اپنے کمرے میں جانے کا مطلب یہ نہیں کہ میں سو جاتی ہوں۔
میں کمرے سے نکلنے لگی تو اچانک مڑ کر میں نے سارہ کی پیشانی پر پیار کیا جو اس سے پہلے کبھی نہیں
کیا تھا۔ پوتے شارق کو تو اکثر لپٹا لیتی تھی، سارہ سے کچھ جھجک سی تھی۔ سارہ نے میرے گلے میں
باہیں ڈال دیں۔ ارے! یہ سارہ تھی، جس کو میں اکھڑ اور اکیل کھری سمجھتی تھی۔ ایک عجیب سی خوشی
کی لہر میرے جسم میں دوڑ گئی، میں نے اسکو لپٹا لیا۔ اس طرح والہانہ انداز میں شاید میں نے کبھی
اپنی پوتی کو گلے نہیں لگایا تھا۔

اب ہفتے میں کم از کم ایک بار سارہ کے ساتھ میں فیس بک میں اپنے رشتہ داروں اور
ان کے بچوں کی تصویریں اور پیغام دیکھتی ہوں، وہ میرے لئے کہاں کہاں سے ڈھونڈ کر رشتہ
داروں کا پتہ چلاتی ہے، میرے پیغامات لکھتی ہے۔ میرے پرانے البموں سے نکال کر ساری
تصویریں نہ جانے کس طرح کمپیوٹر پر سجا دیں، سب رشتے داروں کی بھیج دیں۔ سارہ کو اب شعر و
شاعری کا شوق ہو گیا ہے، مجھ سے پوچھ کر انگریزی رسم الخط میں اردو شعر اپنے دوستوں کو بھیجتی
ہے، وہ حیران ہوتی ہے کہ اتنے شعر مجھے کیسے یاد ہیں۔ اسے یہ جان کر بہت حیرت ہوئی کہ مجھے
انگریزی بھی آتی ہے۔ وہ میرے بچپن کی باتیں کھوج کھوج کر پوچھتی ہے، اپنے کالج کے قصے
مجھے سناتی ہے۔

کاش! میں پہلے ہی سارہ کے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر چلی گئی ہوتی۔ میرے
کمرے کی کھڑکی سے صرف مٹھی بھر آسمان ہی نظر آتا ہے تو کیا ہوا۔ اب سارہ نے میرے لیے
ایک اور کھڑکی کھول دی ہے۔

☆☆

یہ نصف صدی کا قصہ ہے

ابھی تھوڑی دیر پہلے ماجد کا امریکہ سے فون آیا تھا۔ اصرار کر رہا تھا کہ اس بار میں سالانہ چھٹیوں میں حیدر آباد نہ جاؤں، اس کے پاس امریکہ چلی آؤں، اس نے نیا گھر خریدا ہے، وہ بھی دیکھ لوں گی۔ ماجد کی دادی زبیدہ کے انتقال کو اب پانچ برس ہوگئے اور میری آزمائش کا زمانہ بھی شکر ہے تمام ہوا۔ وہ گھٹن، وہ الجھن، وہ غصہ جو میں برسوں سے خاموشی سے پی رہی تھی اس سے نجات مل گئی مجھے۔ کیا ماجد کو اس کا اندازہ تھا؟..... اسے کچھ معلوم تھا.....اللہ جانے.. ہاں یہ بات تو ہے کہ اس نے اپنی دادی کو کبھی امریکہ نہیں بلایا۔ وہ وہیں تھیں کراچی میں۔ البتہ ان کا خرچہ وہ پابندی سے بھیجتا تھا، خیر خبر رکھتا تھا۔ کیا ماجد اپنی زندگی کی یہ کہانی جانتا تھا؟

ڈاکٹر سلیمہ نے ٹھنڈی سانس لے کر کرسی کی پشت پر سر ٹکا دیا۔ وہ سوچ رہی تھیں.... ماجد اب خوش خرم اچھی بھلی زندگی گذار رہا ہے میرے لئے یہ ہی بہت ہے۔ لیکن اتنے عرصے میں کس طرح خاموش رہی، دل چاہتا تھا کہ زبیدہ کی اصلیت سب کے سامنے کھول کر رکھ دوں۔ مگر سوچتی تھی کہ اس سے اب کیا حاصل ہوگا.... سو میں نے وہی کیا جو مجھے صحیح لگا.... کتنا وقت گذر گیا..... مجھے یہاں جدہ میں رہتے ہوئے چالیس سال ہوگئے۔ یہ نصف صدی کا قصہ ہے...

ہاں تقریباً نصف صدی کا ہی قصہ ہے۔ کہاں سے یہ کہانی شروع کروں، میں تو کبھی اس کا مرکزی کردار تھی ہی نہیں۔ مگر آج تک اس کہانی سے جڑی ہوئی ہوں..... ماشاللہ ماجد انجینیر ہے، اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گذار رہا ہے۔ وہ مجھے پابندی سے فون کرتا ہے، میری صحت کے بارے میں فکر مند رہتا ہے..... ہمارا رشتہ ہی کیا ہے؟ کوئی خونی رشتہ نہیں۔ درد کا رشتہ کہوں یا ہموطنی کا یا شاید پھر انسانیت کا؟ یا اس ماما کے جذبے کا جو خونی رشتوں

کی محتاج نہیں ہوتی۔ خونی رشتے! کیا کیا ظلم نہیں ڈھاتے کبھی کبھی یہ خونی رشتے۔

میرا کردار اس کہانی میں برسوں پہلے شامل کیسے ہوا تھا.... وہ شام آج بھی مجھے یاد ہے۔ آج سے کوئی تیس برس پہلے کی شام ۔ میری رشتے کی نند صباحت اپنے شوہر کے ساتھ ہندوستان سے عمرہ کرنے آئی ہوئی تھیں۔ میں صباحت کو اپنے واقف کار اور ہاسپٹل میں ساتھ کام کرنے والے ڈاکٹر یوسف کے گھر ملانے لے گئی جو کراچی سے چند سال پہلے جدہ آئے تھے۔ ان کا خاندان قیام پاکستان کے بعد ہندوستان سے ہجرت کر کے کراچی میں بس گیا تھا۔ ہندوستان کے اسی علاقے سے ان کا تعلق تھا جہاں کے ہم رہنے والے ہیں۔ ڈاکٹر یوسف کے ساتھ ان کی بوڑھی مگر رعب دار، شاندار اور باتونی والدہ بھی تھیں جو سارے گھر پر حاوی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی بیگم نسیم فرماں بردار اور خاموش طبع عورت تھی اپنے تین بیٹوں کو پالنے پوسنے اور ساس کی خدمت میں ہمیشہ مصروف نظر آتی تھیں۔

ہاں! تو بات اس شام کی ہو رہی تھی جب میں اس کہانی میں شامل ہوئی تھی۔ اس شام میں اور صباحت ڈاکٹر یوسف کی والدہ سے باتیں کر رہے تھے کہ ڈاکٹر صاحب اندر داخل ہوئے۔ ان کو دیکھ کر صباحت کے چہرے پر ایک عجیب سے دہشت اور حیرت کا ملا جلا تاثر ابھر آیا۔ اسنے کچھ ادھر ادھر کی باتیں کیں اور پھر یونہی سرسری طور پر ان کے بچوں سے ملنے کی فرمائش کی۔ بچے آئے، میں دیکھ رہی تھی کہ صباحت ان کے سب سے بڑے بارہ سالہ بیٹے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

جیسے ہی ہم واپس جانے کے لئے گاڑی میں بیٹھے تو مجھے لگا کہ صباحت عجب بے چین سی ہے۔ کچھ کہنا چاہتی ہے۔ میں نے پوچھا بھی کیا بات ہے۔ اس نے ڈرائیور کی طرف دیکھا، کچھ کہنے کے لئے منہ کھولا، پھر کچھ کہتے کہتے رُک گئی۔ بس اتنا کہا۔

''کچھ نہیں بھابی! بس کوئی پرانی بات یاد آ گئی۔

میں سمجھ گئی کہ وہ ہمارے حیدر آبادی ڈرائیور کے سامنے کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ گھر میں داخل ہوتے ہی وہ میرا ہاتھ پکڑ کر بیڈ روم میں لے گئی۔ مجھے بستر پر بٹھا دیا اور جلدی جلدی کہنے لگی۔

''بھابی! یہ جو آپ کے ڈاکٹر یوسف ہیں نا!... میرے بچپن کی دوست ذکیہ کے شوہر ہیں، میں انکی شادی میں شریک ہوئی تھی اور ایک دو بار شادی کے بعد بھی ان سے مل چکی ہوں'' وہ گھبرا گھبرا کر کہے جا رہی تھی۔

''پتہ ہے باجی! ان لوگوں نے کیا کیا تھا۔ یہ لوگ بے چاری ذکیہ کا نوزائیدہ بچہ چرا کر چپ چاپ کھوکراپار کے رستے سے پاکستان چلے گئے تھے۔ ابھی ان کی شادی کو ایک سال ہی ہوا تھا۔ سارے محلے میں اس کا چرچا تھا اس بات کا اس زمانے میں کھوکھراپار کے رستے پاکستان جانے کے لئے ابھی کھلے ہوئے تھے..... بس چل دیں دادی اپنے ننھے پوتے کو چرا کر.....''

مجھے یقین نہیں آرہا تھا۔ ڈاکٹر یوسف اتنے مہذب اتنے دیندار آدمی یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ لیکن میں جانتی ہوں کہ صباحت کبھی غلط بیانی سے کام نہیں لیتی تھی۔

وہ کہے جارہی تھی۔ ''میں تو کتنے برسوں سے یہ بات بھلا ہی چکی تھی۔ آج اچانک ڈاکٹر یوسف کو دیکھ کر سب کچھ اس طرح یاد آگیا جیسے کل کی بات ہو۔ بھابی! ان لوگوں نے بے چاری ذکیہ کو بھنک بھی نہیں پڑنے دی... بھابی! آپ نے غور نہیں کیا کہ ان کے بڑے بیٹے کی شکل ڈاکٹر صاحب کی بیوی نسیمہ سے بالکل نہیں ملتی۔ بالکل اپنی ماں ذکیہ کی شبیہ ہے''

''ایسا کیسا ہوسکتا ہے۔ اتنے چھوٹے بچے کو ماں سے جدا کر دینا.... تم نے ڈاکٹر یوسف کی ماں کو پہلے دیکھا تھا.. تم تو کہہ رہی تھیں کہ تم ذکیہ کی شادی میں موجود تھیں؟'' میرا دل یہ سب ماننے کو جیسے تیار نہیں تھا۔

''نہیں..... شادی میں سمدھنوں کو دیکھنے کا شوق کبھی مجھے نہیں رہا... اور ذکیہ کی شادی میں تھوڑی دیر کو ہی گئی تھی... دولہا کو البتہ دیکھا تھا۔ شادی کے بعد ایک آدھ بار جب وہ ذکیہ کے میکے میں آئے تب دیکھا تھا۔ ذکیہ کی سسرال دوسرے محلے میں تھی۔ میں کبھی وہاں نہیں گئی''

صباحت جیسے خواب میں بول رہی تھی۔

''لوگوں نے بتایا کہ ایک رات کو جب ذکیہ سو رہی تھی تو یہ لوگ اس کے ایک مہینے کے بچے کو لے کر چل دئے، طلاق سرہانے لکھ کر رکھ گئے۔ بے چاری ذکیہ کئی سال تک دیوانی سی ہوگئی تھی۔ ان ڈاکٹر صاحب کی والدہ بڑی تیز طرار ہیں، ان کی بہو سے بنتی نہیں تھی۔ ڈاکٹر یوسف اپنی والدہ کی اکلوتی اولاد ہیں، انکے والد کا انتقال بچپن میں ہی ہوگیا تھا۔ والدہ اپنے میکے میں رہتی تھیں۔ کچھ خاندانی جائداد تھی، گذر بسر اچھی خاصی ہو جاتی تھی... یہ سب ایک بار مجھے ذکیہ نے بتایا تھا'' صباحت ماضی میں کھوئی ہوئی بولے جارہی تھی۔

میں ہل کر رہ گئی تھی، میں نے کہا ''میں ڈاکٹر یوسف کے گھرانے کو کئی سال سے جانتی

تھی مگر کبھی بھی ان کی بیوی نسیم نے اس بات کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا کہ ماجد ان کا بیٹا نہیں ہے۔''

''ارے باجی! جو لوگ ایک ماہ کے بچے کو اپنی ماں سے جدا کر سکتے ہیں، وہ نسیم جیسی سیدھی لڑکی کو خاموش رہنے پر مجبور بھی کر سکتے ہیں'' صباحت نے غصے سے کہا

''ذکیہ اب کہاں ہے'' میں بھی اب سب کچھ جاننا چاہتی تھی

''بے چاری ذکیہ کے گھر والوں نے چند سال بعد کسی نہ کسی طرح اس کی شادی دور کسی اور شہر میں کروادی''

میں سوچنے لگی کہ واقعی کبھی ڈاکٹر صاحب کی باتونی والدہ نے جو دنیا بھر کی باتیں اور لن ترانیاں کیا کرتی تھیں ہندوستان میں اپنے آبائی گھر اور محلے کا ذکر نہیں کیا حالانکہ وہ ہمارے ہی شہر کی تھیں۔ البتہ کراچی میں اپنے کچھ رشتے داروں کا ذکر وہ بہت زور شور سے کرتی رہتی تھیں۔

میں نے ظاہر ہے یہ بات کسی کو نہیں بتائی۔ بتانے سے فائدہ بھی کیا تھا، اس راز کو مشتہر کرنے سے کس کا بھلا ہونا تھا۔ دل تو چاہتا تھا کہ ڈاکٹر یوسف کے خاندان سے کوئی تعلق نہ رکھوں لیکن نہ جانے کیوں ماجد کیلئے میرے دل میں عجیب طرح کی محبت نے گھر کرلیا تھا، ڈاکٹر یوسف کی بیگم نسیم کی خاموشی پر حیرت ہوتی تھی لیکن وہ بھی مجھے کچھ مظلوم سی لگتی تھی۔

دنیا کا کاروبار یوں ہی چلتا رہا۔ کہ اچانک ایک صبح ہاسپٹل گئی تو یہ خبر ملی کہ چند گھنٹے پہلے ڈاکٹر یوسف کا کار کے حادثے میں انتقال ہوگیا۔ کسی والدہ کا اکلوتا جوان بیٹا ختم ہوجائے تو ماں کا کیا حال ہوتا ہے کہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں لیکن جب میں ان کو بین کرتے دیکھ رہی تھی تو ذہن کے نہاں خانوں سے بدنصیب ذکیہ کا سراپا ابھر آتا تھا جو برسوں پہلے ایک دن سو کر اٹھی ہوگی اور اپنے بچے کو پہلو میں نہیں پایا ہوگا۔ طلاق نامہ اس کا منہ چڑا رہا ہوگا۔ اب جانے اسے یہ معلوم بھی ہے کہ نہیں کہ اس کا بیٹا زندہ ہے۔

ڈاکٹر یوسف کے دوستوں نے کسی طرح ان کے واجبات اسپتال سے دلوائے، گھر کا ساز وسامان فروخت کرایا، ان سب کو پاکستان بھجوایا۔ میں بھی کسی حد تک اس میں شامل رہی۔ کچھ ماہ بعد پتہ چلا کہ ڈاکٹر صاحب کی بیوہ نسیم اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر اپنے مائیکہ چلی گئیں بس ماجد دادی کے پاس رہ گیا۔ نہ جانے کیوں مجھے رہ رہ کر ماجد کا خیال آتا تھا۔ مجھے معلوم ہوا کہ اسے تعلیم مکمل کرنے کے لئے مالی دشواری کا سامنا ہے تو میں نے کسی طرح اس سے رابطہ

کر کے اس کی مدد کی۔ مجھے لگتا تھا کہ کوئی غیبی طاقت مجھ سے کہہ رہی ہے کہ کیا ہوا جو تیری اولاد نہیں، ماںتا کا جذبہ تو بہت وسیع ہوتا ہے اور یہ ہی ماںتا کا جذبہ مجھے آج تک ماجد سے جوڑے ہوئے ہے۔ ایک بار میں اس سے ملنے پاکستان بھی گئی۔ تب تک وہ ملازم ہو گیا تھا۔ اس نے میری بہت خاطر کی۔ جب اس کی شادی کی بات چل رہی تھی تو اس نے لڑکی کے کوائف اور تصویر مجھے بھی بھیجی تھی۔ اب وہ امریکہ میں ہے اپنے بیوی بچوں کے ساتھ۔

کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ اس کی ماں ذکیہ کو ڈھونڈ نکالنا کوئی ناممکن کام بھی نہیں تھا۔ میرے بہت سے جاننے والے ہندوستان اور بیرونی ممالک میں ہیں، کہیں نہ کہیں سے میں کھوج کر ذکیہ کا اتا پتا معلوم ہی کر سکتی تھی۔ لیکن سوچتی تھی کہ ہوسکتا ہے ذکیہ اپنے گھر بار میں رچ بس گئی ہو، کیوں اس کی زندگی اتھل پتھل کروں۔ اور نہ جانے ذکیہ کے سسرال والوں کو اس کی پہلی شادی اور بچے کے بارے میں سب معلوم ہے کہ نہیں۔

میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ ماجد کو اپنی زندگی کی کہانی پوری طرح معلوم ہے کہ نہیں۔ ہاں اتنا ضرور ہے کہ اپنی دادی سے اس کا کوئی دلی تعلق نہیں ہے۔ بس وہ ان کی کفالت کرتا ہے۔

جو بھی ہو جانے ان جانے میں ہی جیسے اس کہانی کو مرکزی کردار بن گئی ہوں۔ مجھے اللہ نے ایک بیٹا دے دیا ہے۔

☆☆☆

ANGAN JAB PARDES HUA
(Short Storeis)

by

Azra Naqvi

نام : عذرا نقوی

پیدائش : دہلی

تعلیم : ایم۔ایس۔سی: (علی گڑھ)

ایم فل جے این یو (دہلی)

گریجوٹ ڈپلوما ان ایجوکیشن اور سارٹیفکلٹ ان فرنچ لینگویج:

کنکورڈیا یونیورسٹی (مانٹریل، کناڈا)

ملازمت : معلمہ، آزاد صحافی، براڈ کاسٹر، سوشل ورکر

تصنیفات : (۱) آنگن جب پردیس ہوا (افسانوی مجموعہ)

(۲) دل کے موسم (شعری مجموعہ)

(۳) جہاں بنالیں اپنا نشیمن (مضامین اور اخباری کالم) (زیر طبع)

تراجم : انگریزی سے اردو

(۱) سعودی عرب کی قلم کار خواتین کی منتخب کہانیاں (ترجمہ)

(۲) میرے شب و روز (سعودی صحافی احمد السباعی کی خودنوشت) (ترجمہ)

عذرا نقوی زمانہ طالب علمی میں اے۔ایم۔یو کی نمائندگی کرتے ہوئے ہندوستان کے مختلف شہروں میں منعقدہ طالب علموں کے سمر کیمپس اور یوتھ فیسٹولز میں شامل رہیں۔اسی سلسلے میں گاندھی جی کے واردھا آشرم میں بھی کچھ وقت گذارا۔عذرا کچھ عرصے تک آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس پر جزوقتی اناونسر رہی ہیں۔

پچھلے تیس برس انھوں نے بیرونِ ملک گذارے اور اب ہندوستان واپس آ گئی ہیں۔بیرون ملک اپنے قیام کے دوران وہ مختلف ممالک میں ادبی اور ثقافتی اور سماجی سرگرمیوں میں مصروف رہی ہیں۔کناڈا میں تعلیم کے ساتھ ساتھ انھوں نے ہندوپاک کی خواتین کے ساتھ مل کر جنوبی ایشیا کی مہاجر خواتین کے لئے ایک کمیونٹی سینٹر" ساوتھ ایشیا ویمنز سینٹر" کی بنیاد ڈالی۔اس کے علاوہ عذرا مانٹریال میں "تیسری دنیا" نام کا ایک تھیٹر گروپ تشکیل دینے میں معاون رہیں، یہ گروپ اردو، ہندی، انگریزی اور فرنچ زبان میں ڈرامے اسٹیج کرتا تھا۔سعودی عرب کے اپنے طویل قیام کے دوران انھوں نے اردو اور انگریزی اخباروں میں آزاد صحافی کے طور پر کام کیا۔کناڈا، امریکہ، مشرق وسطی، پاکستان اور ہندوستان میں متعدد مشاعروں میں شرکت کر چکی ہیں۔

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

₹ 200.00